داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات: 360، قیمت 450 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 400 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
(دوسرا ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 400 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(پہلا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 450 روپے

★ عمدہ طباعت ★ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ★ امپورٹڈ پیپر

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
جنوری ۲۰۱۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

سیرتِ مُصطفیٰ ﷺ میں عصرِ حاضر کے لیے پیغام
"قول و فعل میں مطابقت کی ضرورت و اہمیت"

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا "ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد : 62

شمارہ : 1

ربیع الاوّل 1434ھ

جنوری 2013ء

فی شمارہ 25/-

مدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مجلد جدید پریس (پرائیویٹ) چگلا

مشمولات

عرضِ احوال — 3

فضائے بدر پیدا کر..... — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن — 5

سورۃ ھود (آیات ۱ تا ۲۴) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

سیرتِ طیّبہ — 22

سیرتِ مصطفیٰ ﷺ میں عصرِ حاضر کے لیے پیغام
''قول و فعل میں مطابقت کی ضرورت و اہمیت'' — پروفیسر حافظ احمد یارؒ

مطالعہ حدیث — 35

مذمت بدعت (۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعمیرِ سیرت — 53

صبر: اپنی معنویت کے اعتبار سے — عتیق الرحمٰن صدیقی

طُوبیٰ لِلشَّامِ — 63

بلادِ شام اور دورِ فتن: احادیثِ نبویہ کی روشنی میں — ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

افکار و آراء — 73

☆ رحمت کیا ہے؟ — سجاد مسعود قریشی

☆ انسانیت کی معراج — راحیل گوہر 81

حقوق و فرائض (۵) — 85

والدین کے حقوق — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

❁ ❁ ❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فضائے بدر پیدا کر.....

۲۰۱۲ء ختم ہونے کو ہے اور پاکستان کی تاریخ میں دوسری بار ایک جمہوری حکومت اپنی مدت پوری کر رہی ہے۔ پہلی حکومت جس نے اپنا دورِ حکومت مکمل کیا' ایک آمر کے زیر سایہ قائم ہوئی تھی اور دوسری یعنی موجودہ حکومت عوامی حکومت ہونے کی دعوے دار ہے۔ لیکن کارکردگی کے حوالے سے دونوں حکومتوں میں صرف وردی کا فرق ہے' یعنی ایک باوردی آمریت تھی اور دوسری بے وردی آمریت ہے۔ حال تو یہ ہے کہ موجودہ دورِ حکومت میں ہر آنے والا دن عوام کے لیے ایک نیا عذاب لے کر آتا ہے۔ حکومت کی پانچ سالہ کارکردگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ لوگ اس کی طوالت سے تنگ آ کر چھٹکارے کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔

ہماری ملکی سیاست میں یہ فیشن بن چکا ہے کہ ہر حکومت پچھلے حکمرانوں کو موردِ الزام ٹھہرا کر یہی گلہ کرتی ہے کہ اسے یہ مسائل ورثے میں ملے ہیں۔ صدر آصف علی زرداری کی سربراہی میں ان کی ٹیم بھی یہی واویلا کرتی رہی' بلکہ اس حوالہ سے پیپلز پارٹی کو اضافی طور پر یہ شکایت بھی رہی کہ اس کی حکومت کو عدلیہ اور دوسری قوتیں کام کرنے نہیں دے رہیں۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو جتنا فری ہینڈ اس حکومت کو ملا ہے ماضی میں کسی حکومت کو نہیں ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسی فرینڈلی اپوزیشن پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کو ملی پاکستان کی تاریخ میں ایسی ملائم اور تعاون پر آمادہ اپوزیشن کسی اور حکومت کو نصیب نہیں ہوئی۔ ماضی میں اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے سیاست دان حکومت کے خلاف شکایتیں لے کر GHQ پہنچتے تھے اور حکومت کے خلاف اکساتے تھے۔ جرنیل بھی بہانے ڈھونڈتے تھے اور فوج یعنی اسٹیبلشمنٹ حکومت کا تختہ الٹ دیتی تھی یا مارشل لاء لگا دیتی' جبکہ موجودہ حکومت کے بارے میں بعض ذرائع کے مطابق نادیدہ قوتوں کی ان کوششوں کو خود اپوزیشن نے ناکام بنایا۔

کسی بھی حکومت کی کارکردگی کے غیر جانبدارانہ تجزیہ کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ عوام کے ووٹ سے منتخب ہونے والی حکومت نے عوام کے لیے کیا کیا۔ اس اعتبار سے اگر ایک ایک کر کے مختلف شعبوں میں حکومتی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ قرین انصاف ہوگا۔ پارلیمنٹ کا سب سے اہم فنکشن قانون سازی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں آئین کو موم کی ناک طرح ہر حکمران نے جب چاہا اپنی طرف موڑ لیا۔ موجودہ حکومت نے بھی کوئی قابل ذکر قانون سازی نہیں کی جس سے

عوام کو کوئی سہولت ہوتی۔ اس حکومت نے جو آئینی ترامیم بھی کیں وہ حکمرانوں کی اپنی ذات اور جماعت کے فائدے کو دیکھتے ہوئے کیں۔ مثلاً اٹھارہویں ترمیم میں صدر کے اختیارات میں کمی کے ساتھ کسی شخص کے تیسری بار وزیراعظم بننے کی بندش کو ختم کیا گیا۔ اس ترمیم سے عوام کو فائدہ ہوا یا اشخاص کو' اس کا فیصلہ قاری خود کر سکتا ہے۔ انیسویں ترمیم ججوں کے بارے میں ہے اور بیسویں ترمیم میں وزیراعظم کے طریقہ انتخاب کو پیچیدہ بنایا گیا ہے۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ یہ ترامیم حکومت اور اپوزیشن نے کسی قومی مفاد کے پیش نظر نہیں بلکہ باہمی سودا بازی سے اور اپنی اپنی ضرورت کے تحت فوائد حاصل کرنے کے لیے کی ہیں۔

حکومت کی معاشی پالیسیوں کا جائزہ لیا جائے تو معاشی استحکام اور معاشی پالیسیوں میں تسلسل بالکل عنقا ہے۔ ان پانچ سالوں میں ۸۷ سو ارب روپے کے نئے قرضے لیے گئے۔ اس وقت بجٹ کا خسارہ ۴۷ سو ارب روپے سے زیادہ ہے۔ NFC ایوارڈ کا فائدہ بھی صوبوں کو نہیں پہنچایا گیا۔ تین ارب روپے کے کاغذی نوٹ روزانہ چھاپنے سے افراطِ زر کی شرح میں اس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ مہنگائی کا جن قابو سے باہر ہو گیا ہے اور عوام الناس روزمرہ ضروریات پورا کرنے سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔

نائن الیون کے بعد پرویز مشرف نے عوامی مخالفت کے باوجود جس پرائی جنگ میں امریکہ کا اتحادی بننے کا فیصلہ کیا تھا موجودہ حکومت نے امریکی حمایت میں بلکہ صحیح تر الفاظ میں امریکی غلامی اختیار کرنے میں پرویز مشرف کو بھی مات دے دی ہے اور دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں کودنے کے نتیجے میں ہم اب تک تقریباً ۵۰ ہزار قیمتی جانوں کا نقصان کر چکے ہیں۔ ڈرون حملوں میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اسی دور میں امریکہ نے ایبٹ آباد اور سلالہ پر حملہ کیا۔ وہ ریمنڈ ڈیوس جیسے بدنام زمانہ دو جاسوسوں کو چھڑا کر لے گیا۔ اس جنگ میں ۹۴ ارب ڈالر کے مالی نقصان نے پاکستان کو اقتصادی لحاظ سے دیوالیہ کر دیا ہے۔

حکومت کی خارجہ پالیسی میں غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل صرف ایک حالیہ واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاک ایران گیس پائپ لائن معاہدہ پر دستخط جیسے اہم معاملہ سے صرفِ نظر کر کے صدر زرداری برطانیہ چلے گئے۔ رینٹل پاور پراجیکٹ کے حوالے سے ترک حکومت سے بھی تعلقات میں بگاڑ پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ اب چین بھی ہماری امریکی تابعداری کے پیش نظر آئندہ کسی قسم کا معاہدہ کرتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار نظر آ رہا ہے اور ہماری اس ناعاقبت اندیشی کے باعث مستقبل میں رہے سہے چند دوست بھی دور ہوتے نظر آ رہے ہیں۔

حکومتی کارکردگی کے اس مختصر جائزے کا مقصد اس پہلو پر غور کرنا ہے کہ کیا اس بند گلی سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟ درحقیقت گزشتہ ۶۵ سال میں مسلسل کی جانے

(باقی صفحہ 52 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃ ھُود

تمہیدی کلمات

سورۂ ہود کے دس رکوع ہیں‘ جن میں سے چھ رکوع انباء الرسل پر مشتمل ہیں۔ یہ سورت چونکہ سورۂ یونس کے ساتھ مل کر جوڑا بناتی ہے اس لیے سورۂ یونس کے برعکس اس میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر بہت تفصیل کے ساتھ ہوا ہے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بالکل سرسری انداز میں ہے۔ (سورۂ یونس میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر سرسری انداز میں ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہے۔) ان دونوں پیغمبروں کے ذکر کے درمیان میں باقی رسولوں کا ذکر اس سورت میں بالکل سورۃ الاعراف والے انداز میں ہے‘ یعنی ایک ایک رکوع میں ایک ایک رسول کا تذکرہ ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ’’یارسول اللہ! آپؐ پر بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں‘‘۔ جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا)) (۱) ’’مجھے سورۂ ہود اور اس کی ہم مضمون سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے‘‘۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب ان سورتوں میں پے در پے تنبیہات نازل ہو رہی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت یہ اندیشہ گھلائے دیتا ہوگا کہ کہیں اللہ کی دی ہوئی مہلت ختم نہ ہو جائے اور وہ آخری ساعت نہ آ جائے جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عذاب میں پکڑ لینے کا فیصلہ صادر فرما دیتا ہے۔

(۱) رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ المصابیح‘ کتاب الرقاق‘ باب البکاء والخوف‘ الفصل الثانی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آیات ۱ تا ۸

الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا
اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ﴿۲﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ
مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ؕ﴿۳﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؕ﴿۴﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ
يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ؕ﴿۵﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا
وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ؕ﴿۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ
سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ
اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ؕ﴿۷﴾ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ
اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸﴾

آیت ۱ ﴿الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾﴾ ’’الٓرٰ۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات (پہلے) پختہ کی گئی ہیں‘ پھر ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے اُس ہستی کی طرف سے جو حکیم اور خبیر ہے۔‘‘

اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں شروع شروع میں جو سورتیں نازل ہوئی ہیں وہ حجم کے اعتبار سے تو چھوٹی‘ لیکن بہت جامع اور گہرے مفہوم کی حامل ہیں‘ جیسے کوزے میں سمندر کو بند کر دیا گیا ہو۔ مثلاً سورۃ العصر‘ جس کے بارے میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں: لَوْلَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسِ یعنی ’’اگر اس سورت کے علاوہ قرآن میں کچھ بھی نازل نہ ہوتا تو بھی یہ سورت لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی تھی‘‘۔ امام شافعیؒ سورۃ العصر

کے بارے میں مزید فرماتے ہیں: لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ ''اگر لوگ اس سورت پر ہی تدبر کریں تو یہ ان کی ہدایت کے لیے کافی ہو جائے گی''۔ چنانچہ قرآن مجید کی ابتدائی سورتیں اور آیات بہت محکم اور جامع ہیں اور بعد میں انہی کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اور اس کتاب کا بنیادی پیغام یہ ہے:

آیت ۲ ﴿اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ ۙ﴾ ''کہ مت عبادت کرو کسی کی سوائے اللہ کے۔ یقیناً میں ہوں تمہارے لیے اُسی کی جانب سے خبردار کرنے والا اور بشارت دینے والا۔''

انبیاء ورسل کے لیے قرآن میں بشیر اور نذیر کے الفاظ بار بار آتے ہیں۔ جیسے سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۱۶۵﴾﴾ اور سورۃ الانعام میں فرمایا: ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۚ﴾ (آیت ۴۸)

آیت ۳ ﴿وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّیُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ﴾ ''اور یہ کہ اپنے رب سے استغفار کرو، پھر اُس کی جناب میں توبہ کرو، وہ تمہیں (دُنیوی زندگی میں) مال ومتاع دے گا بہت اچھا ایک وقتِ معیّن تک اور ہر صاحب فضل کو اُس کے حصے کا فضل عطا کرے گا۔''

یہاں ذِیْ فَضْلٍ سے مراد ہے 'مستحقِ فضل'۔ یعنی جو بھی فضل کا مستحق ہوگا' اللہ تعالیٰ اُسے اپنا فضل ضرور عطا فرمائے گا۔

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ كَبِیْرٍ ﴿۳﴾﴾ ''اور اگر تم پھر جاؤ گے تو مجھے اندیشہ ہے تم پر ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا۔''

آیت ۴ ﴿اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴﴾﴾ ''اللہ ہی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے' اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۵ ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ﴾ ''آگاہ ہو جاؤ یہ لوگ اپنے سینوں کو دہرا کرتے ہیں تاکہ اللہ سے چھپ جائیں۔''

یہ مقام مشکلات القرآن میں سے ہے اور اس کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں۔ ثَنٰی

یَثْنِیْ کے معنی پھیرنے' موڑنے اور لپیٹنے کے ہیں۔ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے مخالفین میں سے کچھ لوگوں کا رویہ ایسا تھا کہ آپ ﷺ کو آتے دیکھتے تو رخ بدل لیتے یا کپڑے کی اوٹ میں منہ چھپا لیتے' تاکہ کہیں آمنا سامنا نہ ہو جائے اور آپ ﷺ انہیں مخاطب کر کے کچھ اپنی باتیں نہ کہنے لگیں۔ یہاں ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ حق کا سامنا اور حقیقت کا مواجہہ کرنے سے گھبراتے ہیں' حالانکہ کسی کے گریز کرنے سے حقیقت غائب نہیں ہو جاتی۔ شتر مرغ طوفان کے دوران اگر ریت میں سر چھپا لے تو اس سے طوفان کا رخ تبدیل نہیں ہو جاتا۔

اس کے علاوہ ایک رائے وہ ہے جو بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل ہوئی ہے کہ کچھ اہل ایمان پر حیا کا بہت زیادہ غلبہ تھا (مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان اصحاب میں بہت نمایاں تھے) ایسے لوگ کبھی غسل کے وقت بھی عریاں ہونا پسند نہیں کرتے تھے اور ایسے مواقع پر اس انداز سے جھک جاتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو ستر چھپا رہے۔ اسی طرح قضائے حاجت کے وقت بھی پورے ستر کا اہتمام کرتے تھے۔ اس حوالے سے اس حکم کا منشا یہ ہے کہ تم اس سلسلے میں جو کچھ بھی کر لو' اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے تو نہیں چھپ سکتے ہو۔ لہٰذا ستر چھپانے کے بارے میں جو بھی احکامات ہیں اُن کی معروف طریقے سے پیروی کرو۔ اس طرح کے کسی بھی معاملہ میں غلو کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَهُمْ ۙ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۵﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ جب وہ اپنے اوپر اپنے کپڑے لپیٹتے ہیں تب بھی اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپا رہے ہوتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ تو اس کو بھی جانتا ہے جو کچھ سینوں کے اندر ہے۔''

آیت ۶ ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ ''اور نہیں ہے کوئی بھی چلنے پھرنے والا (جاندار) زمین پر' مگر اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے''

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے اندر تقسیم رزق کا جو نظام وضع کیا ہے اس میں اس نے ہر جاندار کے لیے اس کی ضروریاتِ زندگی فراہم کر دی ہیں۔ بچے کی پیدائش بعد میں ہوتی ہے مگر اس کے لیے ماں کی چھاتیوں میں دودھ پہلے پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ اللہ کے اس نظام اور اس کے قوانین کو پسِ پشت ڈال کر کوئی ایسا نظام یا ایسے قوانین وضع کرے جن کے تحت ایک فرد کے حصے کا رزق کسی دوسرے کی جھولی میں چلا

جائے‘ تو رزق یا دولت کی تقسیم کا خدائی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لوٹ کھسوٹ کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ کہیں دولت کے بے جا انبار لگیں گے اور کہیں بے شمار انسان فاقوں پر مجبور ہو جائیں گے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی رزق کی تقسیم میں کوئی کمی بیشی نظر آئے تو سمجھ لو کہ اس کا ذمہ دار خود انسان ہے۔

﴿وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا﴾ ’’اور وہ جانتا ہے اس کے مستقل ٹھکانے کو بھی اور اس کے عارضی طور پر سونپے جانے کی جگہ کو بھی۔‘‘

مُستَقَر اور مُستَودَع دونوں الفاظ کی تشریح سورۃ الانعام کی آیت ۹۸ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکی ہے۔ وہاں ان الفاظ کے بارے میں تین مختلف اقوال بھی زیر بحث آ چکے ہیں۔

﴿كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۶﴾ ’’یہ سب کچھ ایک روشن کتاب میں (درج) ہے۔‘‘

وہی روشن اور واضح کتاب جو علمِ الٰہی کی کتاب ہے۔

آیت ۷ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾

’’اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں اور اُس کا تخت تھا پانی پر‘‘

میرے نزدیک یہ آیت آج بھی متشابہات میں سے ہے‘ لیکن شاید یہ اُس دَور کی طرف اشارہ ہے جب یہ دُنیا معرضِ وجود میں آئی۔ زمین کی تخلیق کے بارے میں سائنسی اور تاریخی ذرائع سے اب تک ملنے والی معلومات کو مجتمع کر کے جو آراء سامنے آئی ہیں اُن کے مطابق زمین جب ٹھنڈی ہونی شروع ہوئی تو اس سے بخارات اور مختلف اقسام کی گیسیں خارج ہوئیں۔ انہی گیسوں میں سے ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملنے سے پانی پیدا ہوا جو لاکھوں سال تک بارشوں کی صورت میں زمین پر برستا رہا۔ پھر جب زمین ٹھنڈی ہو کر سکڑی تو اس کی سطح پر نشیب و فراز پیدا ہونے سے پہاڑ اور سمندر وجود میں آئے۔ اُس وقت تک کسی قسم کی کوئی مخلوق پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس زمین کی حد تک اللہ تعالیٰ کا تختِ حکومت (اس کا تصور انسانی ذہن سے ماوراء ہے) پانی پر تھا۔ پھر وہ دور آیا جب زمین کی آب و ہوا زندگی کے لیے موافق ہوئی تو مٹی اور پانی سے وجود میں آنے والے دلدلی علاقوں میں نباتاتی یا حیوانی مخلوق کی ابتدائی شکلیں پیدا ہوئیں۔ (واللہ اعلم!)

﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ’’تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے

عمل کرنے والا۔‘‘

یعنی انسانی زندگی کا وہ حصہ جو اس دنیا میں گزرتا ہے اس کا اصل مقصد امتحان ہے۔ علامہ اقبال نے اس شعر میں اس آیت کی بہت خوبصورت ترجمانی کی ہے:

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

﴿وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷﴾ ’’اور اگر آپؐ کہیں کہ تمہیں اٹھایا جائے گا مرنے کے بعد تو کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔‘‘

آیت ۸ ﴿وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ﴾

’’اور اگر مؤخر کیے رکھیں ہم اُن سے عذاب کو ایک خاص مدت تک تو وہ کہتے ہیں کہ کس چیز نے روک رکھا ہے اسے؟‘‘

کہ اتنے عرصے سے آپ (ﷺ) ہمیں دھمکیاں دے رہے ہیں کہ تم پر عذاب آنے والا ہے‘ مگر اب تک وہ عذاب آیا کیوں نہیں؟ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے؟

﴿اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸﴾

’’آگاہ ہو جاؤ! جس دن یہ اُن پر آ جائے گا تو ان کی طرف سے پھیرا نہیں جائے گا‘ اور اُن کو گھیرے میں لے لے گی وہی چیز جس کا یہ لوگ استہزا کیا کرتے تھے۔‘‘

آیات ۹ تا ۲۴

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ

شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ﴿۱۲﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ
وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا
لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ
فِیْهَا وَهُمْ فِیْهَا لَا یُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ
وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ
رَّبِّهٖ وَیَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤی اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ
یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِیْ
مِرْیَةٍ مِّنْهُ ۫ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَمَنْ
اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ وَیَقُوْلُ
الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۸﴾
الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ
كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ یَكُوْنُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ؕ یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا
كَانُوْا یُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰی وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِیْرِ وَالسَّمِیْعِ ؕ هَلْ
یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع

آیت ۹ ﴿وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً﴾ ''اور اگر ہم مزہ چکھاتے ہیں انسان کو اپنی طرف سے رحمت کا''

﴿ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَیَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾﴾ ''پھر (جب) ہم اس سے وہ چھین لیتے ہیں تو وہ ہو جاتا ہے بالکل مایوس' نہایت ناشکرا۔''

انسان بنیادی طور پر کوتاہ نظر اور ناشکرا ہے۔ کسی نعمت' کامیابی یا خوشی کے بعد اگر اسے کوئی مشکل پیش آتی ہے تو اُس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ اس پر کبھی اللہ کی نظر کرم بھی تھی۔ چاہیے تو یہ کہ اچھے حالات میں انسان اللہ کا شکر ادا کرے اور جب کوئی سختی آ جائے تو اس پر صبر کرے اور ساتھ ہی ساتھ دل میں اطمینان رکھے کہ ہر طرح کے حالات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں' اگر آج سختی ہے تو کل آسائش بھی تو تھی۔

آیت ۱۰ ﴿وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ ؕ﴾ ''اور اگر ہم مزہ چکھائیں اسے نعمتوں کا کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی ہوئی تھی تو ضرور کہے گا کہ میرے تو سارے دلدّر دُور ہو گئے۔''

﴿اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾﴾ ''بے شک وہ اترانے والا اور فخر جتانے والا ہے۔''

جب کسی سختی کے بعد انسان کو آسائش یا کوئی نعمت مل جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ اسے اللہ کی رحمت اور اس کا انعام سمجھتے ہوئے سجدۂ شکر بجا لائے' وہ اس پر اترانا اور ڈینگیں مارنا شروع کر دیتا ہے اور اسے اپنی تدبیر کا نتیجہ اور اپنی محنت کا صلہ قرار دیتا ہے۔

آیت ۱۱ ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ﴾ ''سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے صبر کی روش اختیار کی اور نیک اعمال کیے۔''

یعنی سب انسان ایک جیسے نہیں' کچھ ایسے بھی ہیں جن کو اللہ نے حقیقی ایمان کی نعمت سے نواز رکھا ہے اور ایمان کے نتیجے میں ان کے دل صبر کی دولت سے مالا مال ہیں اور ان کے کردار سے اعمالِ صالحہ کے نور کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ ﴿۱۱﴾﴾ ''انہی کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) شاید آپ کچھ چیزیں چھوڑ دیں اُس میں سے جو آپ کی طرف وحی کی جا رہی ہے''

﴿وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ﴾

''اور آپ کا سینہ اُس سے تنگ ہو رہا ہے جو وہ کہہ رہے ہیں' کہ کیوں نہیں ان کے اوپر اتار دیا گیا کوئی خزانہ یا کیوں نہیں آیا ان کے پاس کوئی فرشتہ۔''

یہ مضمون اس سے پہلے بڑی وضاحت کے ساتھ سورۃ الانعام میں آ چکا ہے' لیکن زیر مطالعہ گروپ کی مکی سورتوں میں بھی جا بجا مشرکین کی ایسی باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں گروپس میں شامل یہ تمام مکی سورتیں ایک ہی دور میں نازل ہوئی ہیں۔

یہاں مکی سورتوں کی ترتیب مصحف کے بارے میں ایک اہم نکتہ سمجھ لیں۔ رسول اللہ ﷺ کے قیامِ مکہ کے بارہ سال کے عرصے کو اگر چار چار سال کے تین حصوں میں تقسیم کریں تو پہلے حصے یعنی پہلے چار سال میں جو سورتیں نازل ہوئیں وہ قرآن مجید کے آخری دو گروپوں میں شامل ہیں' یعنی سورۂ قٓ سے لے کر آخر تک۔ درمیانی چار سال کے دوران نازل ہونے والی سورتیں درمیانی گروپوں میں شامل ہیں اور آخری چار سال میں جو سورتیں نازل ہوئی ہیں وہ شروع کے دو گروپوں میں شامل ہیں۔ ایک گروپ میں سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف جبکہ اس دوسرے گروپ میں سورۂ یونس تا سورۃ المؤمنون (اس میں صرف ایک استثناء ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا)۔

﴿اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۲﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ تو صرف خبردار کرنے والے ہیں' اور ہر چیز کا ذمہ دار اللہ ہے۔''

اس دور کی سورتوں میں مختلف انداز میں بار بار حضور ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپؐ کا فرضِ منصبی یہی ہے کہ آپؐ ان لوگوں کو خبردار کر دیں۔ اس کے بعد تمام معاملات اللہ کے حوالے ہیں۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ ایمان یا ہدایت کی توفیق کسے دینی ہے اور کسے نہیں دینی۔ کوئی معجزہ دکھانا ہے یا نہیں' نافرمانوں کو کب تک مہلت دینی ہے اور کب ان پر عذاب بھیجنا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔

آیت ۱۳ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ﴾ ''کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) اُس نے خود گھڑ لیا ہے۔''

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ﴾ ''آپؐ کہیے کہ اچھا تم لوگ بھی لے آؤ اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی''

مشرکین کو یہ چیلنج مختلف درجوں میں بار بار دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے انہیں کہا گیا تھا کہ اس جیسا قرآن تم بھی بنا کر دکھاؤ (بنی اسرائیل: ۸۸)۔ یہاں دوسرے درجے میں ۱۰ سورتوں کا چیلنج دیا گیا۔ پھر اس کے بعد بر سبیلِ تنزل صرف ایک سورت بنا کر لانے کو کہا گیا' جس کا تذکرہ سورۂ یونس (آیت ۳۸) میں بھی ہے اور سورۃ البقرۃ (آیت ۲۳) میں بھی۔

﴿وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۳﴾ ''اور (اس کے لیے) بلا لو تم جس کو بھی بلا سکتے ہو اللہ کے سوا' اگر تم سچے ہو۔''

آیت ۱۴ ﴿فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ﴾ ''پھر اگر وہ (تمہارے مددگار) تمہاری اس دعا کو قبول نہ کریں''

یعنی اگر وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکیں اور تمہاری مدد کو نہ پہنچ سکیں:

﴿فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۱۴﴾ ''تو جان لو کہ یہ اللہ ہی کے علم سے نازل ہوا ہے اور یہ کہ کوئی معبود نہیں ہے سوائے اُس کے۔ تو کیا اب تم سرِ تسلیم خم کرتے ہو؟''

یہ کفار ہی سے خطاب ہے کہ تم لوگ اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے اپنے معبودوں کو پکار دیکھو' کچھ خود محنت کرو اور کچھ اُن سے کہو کہ وہ القاء اور الہام کریں اور اس طرح مل جل کر دس سورتیں بنا لاؤ۔ اور اگر تمہارے یہ معبود تمہاری اس درخواست کو قبول نہ کر سکیں تو جان لو کہ نہ صرف یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے بلکہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی نہیں۔ تو اس سب کچھ کے بعد بھی کیا تم ماننے والے نہیں ہو؟ زورِ استدلال ملاحظہ ہو کہ ایک ہی دلیل سے قرآن حکیم کے کلامِ الٰہی ہونے کا ثبوت بھی دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید کا بھی۔

آیت ۱۵ ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا﴾ ''جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں''

جن لوگوں کا مقصدِ حیات ہی دنیوی مال و متاع کو حاصل کرنا ہو اور اسی کے لیے وہ رات دن دوڑ دھوپ میں لگے ہوں تو:

﴿نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝۱۵﴾ ''ہم ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ انہیں اسی (دنیا کی زندگی) میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی

نہیں کی جاتی۔‘‘

ان لوگوں کے دل و دماغ پر دنیا پرستی چھائی ہوئی ہے‘ اور انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں دُنیوی زندگی کو حسین و دلکش بنانے کے لیے ہی صرف کر دی ہیں۔ ان کی ساری منصوبہ بندی اسی دنیا کے مال و متاع کے حصول کے لیے ہے۔ چنانچہ اُن کی اونچی اونچی عمارات بھی بن گئی ہیں‘ کاروبار بھی خوب وسیع ہو گئے ہیں‘ ہر قسم کا سامانِ آسائش بھی ان کی دسترس میں ہے‘ عیش وعشرت کے مواقع بھی حسبِ خواہش انہیں میسر ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ:

آیت ۱۶ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ﴾ ’’یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں کچھ نہیں ہے سوائے آگ کے۔‘‘

ان کی ساری محنت اور بھاگ دوڑ اسی دنیا کے لیے تھی‘ لہٰذا ہم نے ان کی محنت کا صلہ اسی دنیا میں دے کر ان کا حساب چکا دیا ہے۔

﴿وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۶﴾ ’’اور اس (دُنیا) میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ سب حبط ہو جائے گا اور جو اعمال انہوں نے کیے وہ بھی ضائع ہو جائیں گے۔‘‘

روزِ محشر انہیں معلوم ہو گا کہ جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا اور جس کے لیے اپنی تمام تر استعدادات اور صلاحیتیں صرف کیں وہ سب ملیامیٹ ہو چکا ہے‘ اور اگر انہوں نے اپنے دل کو بہلانے کے لیے کوئی جھوٹی سچی نیکی کی ہو گی تو وہ بھی بے بنیاد ثابت ہو گی۔

آیت ۱۷ ﴿اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ ’’تو بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہو‘‘

بَیِّنَۃ (واضح دلیل) سے مراد انسان کی فطرتِ سلیمہ ہے۔ انسان کے اندر جو روحِ ربانی پھونکی گئی ہے اس کی وجہ سے اللہ کی معرفت اس کے اندر موجود ہے۔ مگر یہ معرفتِ الٰہی انسان کے اندر خوابیدہ (dormant) ہوتی ہے۔ پھر جب وحی کے ذریعے واضح ہدایت اُس تک پہنچتی ہے تو وہ خوابیدہ معرفت فوراً جاگ جاتی ہے۔

﴿وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ﴾ ’’اور اس کے پیچھے آئے اللہ کی طرف سے ایک گواہ بھی‘‘

یعنی ایک سلیم الفطرت شخص جس کو خود اپنے وجود میں اور زمین و آسمان کی ساخت اور

کائنات کے نظم و نسق میں توحید باری تعالیٰ کی واضح شہادت مل رہی تھی‘ جب اُس کے پاس قرآن کی صورت میں اللہ کی طرف سے ایک گواہی بھی آ گئی‘ تو یہ ’’نورٌ علیٰ نورٍ‘‘ والا معاملہ ہو گیا۔ اور پھر اس پر مستزاد تورات کی تصدیق۔

﴿وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً﴾ ’’اور اس سے پہلے کتابِ موسیٰؑ بھی موجود تھی جو امام (راہنما) بھی تھی اور رحمت بھی۔‘‘

ایسا سلیم الفطرت شخص کیونکر ایمان نہیں لائے گا؟ یہ تمثیل زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۃ النور میں بیان ہوئی ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ ’’یہی لوگ ہیں جو اس (قرآن) پر ایمان لائیں گے۔‘‘

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ﴾ ’’اور جو اس کا انکار کرے گا ان گروہوں میں سے تو آگ ہی اُس کے وعدہ کی جگہ ہے۔‘‘

تو اب جو بھی اس کتاب کے منکر ہوں چاہے وہ مشرکین مکہ میں سے ہوں‘ دوسرے کفار میں سے‘ یا اہل کتاب میں سے‘ ان کا موعود ٹھکانا بس دوزخ ہے۔

﴿فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ﴾ ’’تو آپؐ اس کے بارے میں کسی شک میں نہ پڑیں‘‘

﴿اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۷﴾ ’’یقیناً یہ حق ہے آپؐ کے رب کی طرف سے لیکن اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔‘‘

آیت ۱۸ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا﴾ ’’اور اُس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔‘‘

جس نے خود کوئی چیز گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کر دی۔

﴿اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جو پیش کیے جائیں گے اپنے رب کے سامنے‘‘

﴿وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ﴾ ’’اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے جھوٹ کہا تھا اپنے رب پر۔‘‘

﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۸﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! ایسے ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔‘‘

ان جھوٹ گھڑنے والوں میں غلام احمد قادیانی آنجہانی اور اس جیسے دوسرے مدعیانِ

نبوت بھی شامل ہوں گے۔

آیت ۱۹ ﴿اَلَّذِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَیَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ؕ﴾ ''جو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں۔''

تعلیماتِ حق اور طریقِ ہدایت پر خواہ مخواہ کے اعتراضات کرتے ہیں تاکہ لوگ اس راستے کو اختیار نہ کریں۔

﴿وَہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور یہی لوگ آخرت کے منکر ہیں۔''

یہ وہی بات ہے جو ہم سورۂ یونس میں بار بار پڑھ آئے ہیں: ﴿لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَ نَا﴾ کہ انہیں ہم سے ملاقات کی امید ہی نہیں اور ان کی اصل بیماری بھی یہی ہے کہ وہ دل سے آخرت کے منکر ہیں اور اسی وجہ سے ان کی عقلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

آیت ۲۰ ﴿اُولٰٓئِکَ لَمۡ یَکُوۡنُوۡا مُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ﴾ ''یہ لوگ زمین میں (اللہ کو) ہرگز عاجز کرنے والے نہیں ہیں''

یہ لوگ اللہ کے قابو سے باہر نہیں ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ہرگز شکست نہیں دے سکتے۔

﴿وَمَا کَانَ لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ اَوۡلِیَآءَ ؘ﴾ ''اور نہ ہی اللہ کے سوا ان کا کوئی حمایتی ہے۔''

﴿یُضٰعَفُ لَہُمُ الۡعَذَابُ ؕ﴾ ''ان کے لیے عذاب دوگنا کیا جاتا رہے گا۔''

﴿مَا کَانُوۡا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ السَّمۡعَ وَمَا کَانُوۡا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ ''(اس لیے کہ) نہ تو وہ سننے کی صلاحیت رکھتے تھے اور نہ ہی دیکھتے تھے۔''

وہ بالکل اندھے اور بہرے ہو گئے تھے۔ سورۃ البقرۃ میں ایسے لوگوں کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے: ﴿صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ فَہُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۸﴾﴾۔ حق کے لیے ان لوگوں کے اسی رویہ کی وجہ سے ان کا عذاب بڑھایا جاتا رہے گا۔

آیت ۲۱ ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو برباد کر لیا اور اُن سے گم ہو گیا جو کچھ وہ افترا کیا کرتے تھے۔''

تب انہیں اپنے جھوٹے معبود اور سفارشی' من گھڑت عقائد و نظریات اور اللہ تعالیٰ پر افترا پردازیوں میں سے کچھ بھی نہیں سوجھے گا۔ یہ سب کچھ پادر ہوا ہو جائے گا۔

آیت ۲۲ ﴿لَا جَرَمَ اَنَّہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ ہُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''کچھ شک نہیں کہ آخرت میں سب سے بڑھ کر خسارہ پانے والے یہی لوگ ہوں گے۔''

واضح رہے کہ ''اَخۡسَرُ'' افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔

اہلِ جہنم کے تذکرے کے بعد فوری تقابل (simultaneous contrast) کے لیے اب اہلِ جنت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخۡبَتُوۡۤا اِلٰی رَبِّہِمۡ ۙ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''(اس کے برعکس) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی' وہ ہوں گے جنت والے' اور اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

آیت ۲۴ ﴿مَثَلُ الۡفَرِیۡقَیۡنِ کَالۡاَعۡمٰی وَالۡاَصَمِّ وَالۡبَصِیۡرِ وَالسَّمِیۡعِ ؕ﴾ ''ان دونوں گروہوں کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص اندھا اور بہرہ ہو اور دوسرا دیکھنے اور سننے والا۔''

﴿ہَلۡ یَسۡتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''کیا یہ دونوں برابر ہیں مثال کے اعتبار سے؟ تو کیا تم نصیحت اخذ نہیں کرتے!''

بھلا دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟ کیا تم اس مثال سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے؟

اب اگلے چھ رکوع انباء الرسل پر مشتمل ہیں۔ ان میں انہی چھ رسولوں اور اُن کی قوموں کے حالات بیان ہوئے ہیں جن کا ذکر ہم سورۃ الاعراف میں بھی پڑھ آئے ہیں۔ یعنی حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت شعیب' حضرت لوط اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام۔ یہ چھ رسول ہیں جن کا ذکر قرآن حکیم میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ اس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے اولین مخاطب (اہل عرب) ان سب رسولوں اور ان کی قوموں کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ جس خطے میں یہ رسول اپنے اپنے زمانے میں مبعوث ہوئے اس کے بارے میں کچھ تفصیل ہم سورۃ الاعراف میں پڑھ آئے ہیں۔ یہاں ان میں سے چیدہ چیدہ معلومات ذہن میں پھر سے تازہ کر لیں۔

اگلے صفحے پر جو نقشہ دیا گیا ہے یہ گویا ''ارض القرآن'' کا نقشہ ہے۔ قرآن مجید میں جن رسولوں کے حالات کا تذکرہ ہے وہ سب کے سب اسی خطے کے اندر مبعوث کیے گئے۔ نقشے میں جزیرہ نمائے عرب کے دائیں طرف خلیج فارس اور بائیں طرف بحیرۂ قلزم (بحیرۂ احمر) ہے' جو اوپر جا کر خلیج عقبہ اور خلیج سویز میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

نقشے پر اگر خلیج فارس سے اوپر سیدھی لکیر کھینچی جائے اور خلیج عقبہ کے شمالی کونے سے بھی ایک لکیر کھینچی جائے تو جہاں یہ دونوں لکیریں آپس میں ملیں گی' یہ وہ علاقہ ہے جہاں پر حضرت نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی۔ یہیں سے اوپر شمال کی جانب ارارات کا پہاڑی سلسلہ ہے' جس میں کوہِ جُودی پر آپؑ کی کشتی لنگر انداز ہوئی تھی۔ اس علاقے میں سیلاب کی صورت میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا' جس سے پوری قوم ہلاک ہوگئی۔ اُس وقت تک پوری نسلِ انسانی بس یہیں پر آباد تھی' چنانچہ سیلاب کے بعد نسل انسانی حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہی سے آگے چلی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام سام تھا' وہ اپنی اولاد کے ساتھ عراق کے علاقے میں آباد ہو گئے۔ اس علاقے میں اُن کی نسل سے بہت سی قومیں پیدا ہوئیں۔ انہیں میں سے ایک قوم اپنے مشہور سردار ''عاد'' کے نام کی وجہ سے مشہور ہوئی۔ قومِ عاد جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں احقاف کے علاقے میں آباد تھی۔ اس قوم میں جب شرک عام ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے بہت سے نبی بھیجے۔ ان انبیاء کے آخر میں حضرت ہود علیہ السلام ان کی طرف رسول مبعوث ہو کر آئے۔ آپؑ کی دعوت کو رد کر کے جب یہ قوم بھی عذابِ الٰہی کی مستحق ہو گئی تو حضرت ہود علیہ السلام اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کو ساتھ لے کر عرب کے وسطی علاقے حجر کی طرف ہجرت کر گئے۔ یہاں پھر ان لوگوں کی نسل آگے بڑھی۔ ان میں سے قومِ ثمود نے خصوصی طور پر بہت ترقی کی۔ اس قوم کا نام بھی ثمود نامی کسی بڑی شخصیت کے نام پر مشہور ہوا۔ یہ لوگ فنِ تعمیر کے بہت ماہر تھے۔ چنانچہ انہوں نے میدانی علاقوں میں بھی عالی شان محلات تعمیر کیے اور Granite Rocks پر مشتمل انتہائی سخت پہاڑوں کو تراش کر خوبصورت مکانات بھی بنائے۔ اس قوم کی طرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث کیے گئے۔ یہ تینوں اقوام (قومِ نوحؑ' قومِ عاد اور قومِ ثمود) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے پہلے کی ہیں۔

دوسری طرف عراق میں جو سامی النسل لوگ آباد تھے ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ آپؑ کا تذکرہ قرآن میں کہیں بھی ''انباء الرسل'' کے انداز میں نہیں کیا گیا۔ یہاں سورۂ

نقشہ ''ارض القرآن''

(ان قوموں کے علاقے جن کا ذکر قرآن میں بار بار آیا ہے)

ہود میں بھی آپؑ کا ذکر ''قصص النبیین'' کی طرز پر آیا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے ہجرت کی اور بہت بڑا صحرائی علاقہ عبور کر کے شام چلے گئے۔ وہاں آپؑ نے فلسطین کے علاقے میں اپنے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کو آباد کیا جبکہ اس سے پہلے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو آپؑ مکہ میں آباد کر چکے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام آپؑ کے بھتیجے تھے۔ شام کی طرف ہجرت کرتے ہوئے وہ بھی آپؑ کے ساتھ تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے رسالت سے نواز کر عامورہ اور سدوم کے شہروں کی طرف مبعوث فرمایا۔ یہ شہر بحیرۂ مردار (Dead Sea) کے کنارے پر آباد تھے۔ لہٰذا قوم ثمود کے بعد انباء الرسل کے انداز میں حضرت لوط علیہ السلام ہی کا ذکر آئے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اولاد آپؑ کی تیسری بیوی قطورہ سے ہوئی وہ خلیج عقبہ کے مشرقی علاقے میں آباد ہوئی۔ اپنے کسی مشہور سردار کے نام پر اس قوم اور اس علاقے کا نام ''مدین'' مشہور ہوا۔ اس قوم کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا۔ انباء الرسل کے اس سلسلے میں حضرت شعیب علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر میں مبعوث کیا گیا جو جزیرہ نمائے عرب سے باہر جزیرہ نمائے سینا (Senai Peninsula) کے دوسری طرف واقع ہے۔ آپؑ کی بعثت بنی اسرائیل میں ہوئی تھی‘ جو حضرت یوسف علیہ السلام کی وساطت سے فلسطین سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوئے تھے۔ (سورۂ یوسف میں اس ہجرت کی پوری تفصیل موجود ہے۔)

بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے انبیاء و رسل دنیا کے مختلف علاقوں میں مبعوث فرمائے۔ اُن تمام پیغمبروں کی تاریخ بیان کرنا قرآن کا موضوع نہیں ہے۔ قرآن تو کتابِ ہدایت ہے اور انبیاء و رسل کے واقعات بھی ہدایت کے لیے ہی بیان کیے جاتے ہیں۔ اس ہدایت کے تمام پہلو کسی ایک رسولؑ کے قصے میں بھی موجود ہوتے ہیں مگر مذکورہ چھ رسولوں (علیہم السلام) کا ذکر بار بار اس لیے قرآن میں آیا ہے کہ اُن کے ناموں سے اہلِ عرب واقف تھے اور ان کی حکایات و روایات میں بھی ان کے تذکرے موجود تھے۔

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے
سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہج انقلاب نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک‘
اسلامی انقلاب کے مراحل‘ مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

❁ صفحات: 375 ❁ قیمت اشاعت خاص: 300 روپے اشاعت عام: 200 روپے

''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

❁ صفحات: 64 ❁ قیمت اشاعت خاص: 40 روپے ❁ اشاعت عام: 20 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے‘ ماڈل ٹاؤن لاہور‘ فون: 3-35869501

سیرتِ مصطفیٰ ﷺ میں عصر حاضر کے لیے پیغام
''قول و فعل میں مطابقت کی ضرورت اور اہمیت''

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳﴾ (الصف)

''مؤمنو! ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔ اللہ اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔''

منارِ رشد و ہدایت سحابِ رحمت و جُود
مرے رسولؐ کا اُسوہ' مرے نبی کا وجود (تائب)

بادیٔ النظر میں اس کانفرنس کا مرکزی موضوع ''سیرتِ مصطفیٰ ﷺ میں عصر حاضر کے لیے پیغام'' اس لحاظ سے کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ آنحضور ﷺ تو اللہ تعالیٰ کا آخری اور مکمل پیغام پہنچا چکے۔ ۲۳ برس آپؐ نے اپنے قول و فعل سے اللہ کے پیغام کی اس طرح تبلیغ فرمائی کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ''اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ کہہ کر لاکھوں کے مجمع سے اس حقیقت پر اور اپنی صداقت پر گواہی لے لی' اور پھر ''فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ'' فرما کر قیامت تک کے لیے اللہ کے پیغام کو آگے پہنچانے اور پھیلانے کے لیے تمام مسلمانوں کو خود اپنا پیغامبر مقرر فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعے بھیجے ہوئے اس پیغام کو لفظاً و معناً قرآن کریم اور صاحبِ خلق قرآن کی سیرت' یعنی کتاب و سنت کی صورت میں محفوظ رکھنے کا وعدہ اپنے ذمہ لیا اور چودہ سو برس اس وعدہ کی صداقت پر شاہد عدل ہیں۔ کتاب و سنت سے ملنے والا یہ پیغام اور یہ ہدایت' تمام انسانوں اور سب زمانوں کے لیے ہے۔ پھر عصرِ حاضر کے لیے اب کوئی نیا پیغام دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

پانچویں قومی سیرت کانفرنس (جنوری ۱۹۸۱ء' اسلام آباد) میں پڑھا گیا۔

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ہر زمانے اور ہر نسل کے کچھ ایسے مسائل ہوتے ہیں جو بعض دوسرے مسائل سے زیادہ نمایاں اور زیادہ توجہ طلب ہوتے ہیں یا کچھ خرابیاں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں باقی سب خرابیوں کا سبب بھی کہا جا سکتا ہے اور بعض دفعہ ان کا مجموعی نتیجہ بھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عصر حاضر کے مسائل میں انفرادی سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ہر جگہ ''امن و سکون کا فقدان'' پہلے نمبر پر آتا ہے۔ اس عالمی اضطراب و بے چینی کے اسباب بھی متعدد ہیں اور مظاہر بھی۔ آج کے انسان کو انفرادی سطح پر حُبِّ جاہ و مال سے اجتناب اور زہد و سادگی اختیار کرنے کی تلقین یا اجتماعی سطح پر توسیع پسندی اور استعماری عزائم کی بجائے امن اور سلامتی کی تدابیر بتانے کی ضرورت ہے۔ آج انسان دوستی' صلح پسندی' رواداری' اتحاد و یگانگت' عدل و مساوات' احترامِ حریت' فروغِ علم و حکمت اور خدمتِ خلق وغیرہ موضوعات پر بات کرنا وقت کی پکار ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک مسئلہ پر سیرتِ مصطفیٰ ﷺ میں واضح پیغام اور کافی و مکتفی رہنمائی موجود ہے۔ مگر کیا ہم ہر ملک و ملّت کے مختلف قد و قامت کے لیڈروں اور اس وقت کی عالمی سٹیج کے تمام مدعیانِ ''اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ'' سے ان ہی مذکورہ مسائل و موضوعات پر دھواں دھار بیانات' داد طلب اعلانات اور مسحور کن مگر کھوکھلے پیغامات شب و روز نہیں سنتے رہتے؟ اور اس کے باوجود انسانیت اور شرافت ہے کہ ایک جان بلب مریض کی طرح اپنے نوسر باز معالجوں کی لفظی بازیگریوں سے لحہ بہ لحہ مایوسیوں میں گری جا رہی ہے۔ اگر آج کے زعمائے سیاست اپنے بین الاقوامی معاہدوں' اپنے تلاشِ امن و آشتی کے دعووں اور دین و مذہب کو خیر چھوڑیئے' صرف یو این او کے چارٹر میں اپنے دستخطوں سے دیے گئے وعدوں کی پابندی ہی اسی روح اور جذبہ سے کرتے جس کی مثال رحمۃ للعالمین اور رؤف رحیم نبی ﷺ نے صلح نامہ حدیبیہ کے ضمن میں قائم فرما دی تھی تو آج انسانیت اطمینان کا سانس لے رہی ہوتی۔ عصر حاضر کے عالمی اضطراب کی وجہ تشخیص اور علاج سے نادانی نہیں' بلکہ اس کا اصل سبب ان ''مستبصرین'' کی نیتوں کا فتور اور دلوں کا کھوٹ ہے۔ یہ کہنا کسی طرح مبالغہ نہیں ہوگا کہ عصر حاضر کا سب سے بڑا روگ اور سب سے بڑا مسئلہ دراصل ''قول و فعل کی ثنویت اور گفتار و کردار کی دورنگی'' ہے' جس میں اس دور کے عوام اور خواص سب ہی مبتلا ہیں۔

ہادیٔ برحق محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت پاک اور آپؐ کی لائی ہوئی کتاب کی تعلیمات کی روشنی میں اس موضوع پر گفتگو کرنا میرے نزدیک وقت کی نہایت اہم بات' مضطرب اور

بے چین انسانیت کے لیے پیغامِ نجات اور خود مسلمانوں کے لیے درسِ حیات ہے۔ قول و فعل میں مطابقت کی تاکید اور اس کے برعکس گفتار و کردار کی دورنگی یا منافقت سے تحذیر پر قرآن و سُنّت کی تعلیمات پیش کرنا‘ میرے نزدیک کئی وجہ سے اہم ہے:

(۱) اوّلاً: تو اسی لیے کہ قول و فعل کی دورنگی عصرِ حاضر میں ایک وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے‘ بلکہ بدقسمتی سے اسے عیب کی بجائے ہنر‘ معیارِ دانشوری اور گویا ’’فلاح کی راہ‘‘ سمجھا جانے لگا ہے۔ گاؤں اور محلوں کے چوہدریوں سے لے کر ملکوں کے حکمرانوں تک اور علاقائی رہنماؤں سے لے کر یو این او کے اجارہ داروں تک ہر جگہ یہی برائی ہر طرح کے ’’وڈیروں‘‘ کی امتیازی صفت بن گئی ہے اور یہی خرابی باقی تمام خرابیوں اور مسائل کے جنم کا سبب یا پھر ان کی بقا کا موجب بنی ہوئی ہے۔

(۲) ثانیاً: ایک وجہ میرے اس موضوع کو اختیار کرنے کی یہ بھی ہے کہ سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کا جو درخشاں پہلو سب سے پہلے دنیا نے دیکھا وہ یہی قول و فعل کی مطابقت ہی تو تھا۔ محمد کریم ﷺ کے ہم وطنوں نے آپؐ کو الصادق اور الامین کا لقب کیوں دیا تھا؟ صدق اور امانت کا دارومدار اور بلند معیار قول و فعل میں ادنیٰ تفاوت کے نہ ہونے پر ہی تو ہے۔

(۳) ثالثاً: آنحضرت ﷺ نے سب سے زیادہ دکھ اور پریشانی جماعت منافقین کے ہاتھوں ہی سہی۔ ایذاءِ رسول ﷺ کبیرہ گناہ ہے اور اس کا نفاق کے ساتھ گہرا تعلق ہے تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ کہیں ہم اپنے قول و فعل کے اس تضاد سے ایذاءِ رسولؐ کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟

(۴) رابعاً: آنحضور ﷺ نے صحابہ کی ایسی جماعت تیار فرمائی جس کے ظاہر و باطن کی یکسانیت اور قول و فعل کی مطابقت ہی تو اسلام کے غلبہ اور اس کی اتنی حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اشاعت کا سبب بنی کہ ادیانِ عالم کی تاریخ میں کہیں اس کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔

شاید یہ کہا جائے کہ قول و عمل کی مطابقت کوئی ایسی بات نہیں ہے جو صرف پیغمبرِ اسلام ﷺ سے ہی مختص ہو‘ یہ بات تو کم و بیش تمام مذاہب اور جملہ ادیان کے مسلمات میں سے ہے اور سب ہی ہادی اور پیشوا یہی تعلیم دیتے رہے۔ ہاں یقیناً تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی تعلیمات میں یہ بات بھی شامل تھی۔ صرف تعلیمات میں ہی نہیں بلکہ بالفعل ان کے اقوال و اعمال میں کہیں بھی اختلاف یا مخالفت کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ تمام انبیاء

معصوم تھے۔ انبیاءؑ کے ضمن میں عصمت کا مفہوم اگرچہ وسیع ہے اور تمام احکام و قضایا بھی اس میں شامل ہیں‘ تاہم قول و فعل کی مطابقت بھی تو عصمت یا معصومیت کا ہی ایک پہلو ہے۔ جب چھوٹا بچہ بھولے پن سے یہ کہتا ہے کہ ’’ابو کہہ رہے ہیں کہ وہ گھر میں نہیں ہیں‘‘ تو یہ اسی معصومیت کا ایک مظہر ہوتا ہے جو ہر انسان کی فطری میراث ہے اور جسے وہ بہت سی دوسری فطری خوبیوں کی طرح‘ سنِ شعور میں کھو بیٹھتا ہے۔

اور یہ کوئی ضروری بھی تو نہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا ہر پیغام کوئی نیا انکشاف ہی ہو۔ خود حضور ﷺ نے ’’نَحْنُ معشر الانبياء ديننا واحد‘‘ فرما کر جملہ ہادیانِ عالم کے اصل منبع ہدایت کی وحدت کی خبر بھی دے دی۔ البتہ آنحضرت ﷺ کو زیر بحث معاملے میں بھی یہ فضیلت ضرور حاصل ہے کہ آپؐ نے قول و فعل کے تضاد کی مختلف صورتوں مختلف شعبہ ہائے حیات مثلاً تجارت‘ صنعت‘ حکمت‘ معاشرت اور عبادت وغیرہ سے اس کے تعلق اور اس ضمن میں پیش آنے والے بعض نفسیاتی مغالطوں تک کی مکمل وضاحت فرما دی ہے۔

آیئے اب اس موضوع سے متعلق کتاب و سنت کی تعلیمات پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

(۱) قرآن کریم کے شروع ہی میں سورۃ البقرۃ میں انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر ہے۔ مؤمن مخلص‘ کافر جاحد اور منافق مطلق۔ قلبی نفاق تو قول و عمل کی‘ دانستہ اختیار کردہ‘ شعوری اور ارادی‘ دورنگی ہے اور یہ قول و فعل کے تضاد بلکہ زبان اور دل کی عدمِ رفاقت کی بدترین صورت ہے۔ نفاق‘ کفر اور اسلام کے درمیان ایک ایسی ریاست ہے جہاں سے اسلام میں کفر سمگل ہونے کا کام جاری رہتا ہے۔ اسی لیے نفاق کی اس قسم یعنی نفاق قلبی کے اسباب و علامات اور اس کے علاج یا ہولناک انجام ﴿فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (النساء:۱۴۵) کے متعلق قرآن حکیم میں بالتفصیل بات ہوئی ہے۔ کتاب و سنت کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قول و فعل کا تضاد اگر سوچی سمجھی دورنگی کی بجائے صرف ضعف ایمان یا قوت ارادی کی کمزوری کے باعث ہو تو بھی اسے نفاق ہی کہا گیا ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا ماحصل اور معیار یعنی صفت تقویٰ ہے اور یہ اسی انسانی کمزوری یعنی نفاقِ عملی اور قول و فعل کے تضاد کو کلیتاً مٹانے ﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾ (آل عمران:۱۰۲) کے مطابق یا اسے زیادہ سے زیادہ کم کرنے اور ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن:۱۶) کے مطابق گھٹانے کا نام ہے۔

(۲) قرآن کریم نے کتاب ہدایت کے علمبرداروں اور تلاوت گزاروں میں بھی قول وفعل کا تضاد پائے جانے کو سخت بے عقلی کا کام بتایا ہے: ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (البقرۃ) اور یہ شاید اسی لیے کہ لوگ اسے دانشمندی اور ذہانت کا مظہر سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

(۳) قرآن مجید نے شعروشاعری کے مذموم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شعراء کی آوارگی فکر اور عمل سے پہلوتہی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾ (الشعرآء) علامہ اقبال نے اپنا نام لے کر دراصل شعروشاعری کی اسی عام خرابی یعنی اس کے ''کارِ بیکاراں'' ہونے کا مضمون یوں باندھا تھا:

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا' کردار کا غازی بن نہ سکا!

(۴) قرآن حکیم کی سورۃ الصّف کی دو آیتوں میں تو خاص کر قول بلا فعل کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے مبغوض اور قابل نفرت بات قرار دیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ بعض نکتہ رس مفسّرین مثلاً زمخشری' رازی اور قاسمی وغیرہ نے اس آیت میں کلمہ ''مقت'' کے اختیار کیے جانے کی بنا پر (جو بذات خود اپنے اندر انتہائی نفرت اور شدید ناپسندیدگی کے وسیع معنی رکھتا ہے) اور مزید کَبُرَ اور عِنْدَ اللّٰهِ اور پھر لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کی تکرار کی وجہ سے اسے قول وفعل میں تضاد کی شدید اور ہمہ جہت قدحت کا ایک فصیح وبلیغ نمونہ قرار دیا ہے۔ عمل کی نیت یا ہمت نہ ہو تو محض ڈینگیں مارنا یا پرفریب نعرے لگاتے پھرنا تو کوئی خوبی نہ ہوئی۔

(۵) سورۂ ہود میں حضرت شعیب علیہ السلام کی زبان سے ﴿وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ﴾ کی عبارت میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اپنے عمل سے اپنے ہی قول کی نفی کرنا اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں کا طریقہ ہرگز نہیں ہوتا۔

(۶) سورۂ آل عمران کی ایک آیت میں ﴿يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا﴾ (آیت ۱۸۸) کے مصداق لوگوں یعنی مفت کی شہرت کے طلبگاروں کے لیے' سزا سے نجات

کے راستے بند ہونے کا ذکر کیا گیا ہے: ﴿فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ﴾ (آل عمران:۱۸۸)

یہ تو تھیں وہ آیات جن میں قول اور فعل یا ان کے ہم معنی الفاظ استعمال کر کے انسانی کردار کی اس پستی کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں ظاہر و باطن اور سرو جہر کی ہم آہنگی اور مطابقت پر جو زور دیا گیا ہے' اس کا تعلق بھی اس موضوع سے ہے۔ مثلاً:

(۱) ﴿وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ﴾ (الانعام:۱۲۰)

(۲) ﴿اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ (الاعراف:۳۳)

(۳) ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝﴾ (الانعام)

(وغیر ذلك مِنَ الآیات)

احادیثِ نبویہ میں بھی اسی مضمون کو مختلف پیرایہ ہائے بیان سے واضح کیا گیا ہے۔ دعوتِ فکر کے ساتھ چند احادیث پیش خدمت ہیں:

(۱) حضرت سفیان بن اُسید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كَبُرَتْ خِيَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاكَ حَدِيْثًا هُوَ لَكَ بِهٖ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ لَهٗ بِهٖ كَاذِبٌ)) (۱)

''یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات بیان کرو اور وہ تمہاری تصدیق کرے جبکہ تم اس سے جھوٹ کہہ رہے ہو۔''

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ، ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) (۲)

''کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جسے اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث کیا ہو' مگر یہ کہ اس کے لیے اس کی امت میں سے کچھ لوگ حواری اور اصحاب ہوتے تھے' جو اس کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق چلتے تھے۔ پھر (ہمیشہ ایسا

ہوتا رہا کہ) ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آ جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ تو جو شخص ایسے لوگوں کے ساتھ جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے تو وہ مؤمن ہے' اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے تو وہ مؤمن ہے' اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنے دل سے تو وہ بھی مؤمن ہے۔ اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں!''

(۳) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((يُجَاءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقَى فِي النَّارِ فَتَنْدَلِقُ اَقْتَابُهُ فِي النَّارِ فَيَدُوْرُ كَمَا يَدُوْرُ الْحِمَارُ بِرَحَاهُ ، فَيَجْتَمِعُ اَهْلُ النَّارِ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُوْنَ : اَيْ فُلَانُ مَاشَاْنُكَ؟ اَلَيْسَ كُنْتَ تَاْمُرُنَا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَانَا عَنِ الْمُنْكَرِ؟ قَالَ: كُنْتُ آمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا آتِيْهِ وَاَنْهَاكُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَآتِيْهِ)) (۳)

''قیامت کے روز ایک شخص کو لا کر جہنم میں ڈالا جائے گا تو آگ میں اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی اور وہ اس طرح چکر لگانے لگے گا جیسے گدھا (آٹا پیسنے والی) چکی کے گرد گھومتا ہے۔ پھر اہلِ جہنم اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور اس سے کہیں گے: اے فلاں! تمہارا کیا معاملہ ہے؟ کیا تم ہمیں نیکی کی تلقین نہیں کیا کرتے تھے اور برائی سے نہیں روکا کرتے تھے؟ وہ کہے گا: میں تمہیں تو نیکی کی تلقین کیا کرتا تھا مگر خود اسے اختیار نہیں کرتا تھا اور تمہیں برائی سے روکا کرتا تھا مگر خود اس کا ارتکاب کرتا تھا۔''

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((رَأَيْتُ لَيْلَةَ اُسْرِيَ بِيْ رِجَالًا تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ بِمَقَارِيْضَ مِنْ نَارٍ، فَقُلْتُ: يَا جِبْرِيْلُ مَنْ هٰؤُلَاءِ؟ قَالَ : هٰؤُلَاءِ خُطَبَاءُ مِنْ اُمَّتِكَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَيَنْسَوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتَابَ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ)) .....

وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ: خُطَبَاءُ مِنْ اُمَّتِكَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَقْرَؤُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَلَا يَعْمَلُوْنَ)) (۴)

''جس رات مجھے (آسمانوں کی) سیر کرائی گئی' میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے جواب دیا: یہ آپ کی امت میں سے کچھ خطیب حضرات ہیں' یہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیا کرتے تھے اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے درانحالیکہ یہ کتاب کی تلاوت

بھی کرتے تھے۔ کیا یہ عقل نہیں رکھتے تھے؟'' اور ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

''جبریل نے کہا: یہ آپ کی اُمت میں سے وہ خطیب حضرات ہیں جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور اللہ کی کتاب پڑھتے تھے مگر عمل نہیں کرتے تھے۔''

ان کے علاوہ متعدد احادیث نبویہ میں عبادات و معاملات کے ان شعبوں اور گوشوں کی خصوصاً نشاندہی کی گئی ہے جہاں اس انسانی کمزوری یا کردار کی اس خرابی کا عموماً مظاہرہ ہوتا ہے۔ مثلاً بیع و تجارت (غش)' مواثیق و معاہدات (نقض) اور معاشرت و مخاصمت (گروپ) وغیرہ میں۔ کتاب و سنت میں جہاں جہاں بھی ریاء' بخل' بزدلی' خیانت' جھوٹ فریب' تلون' خوشامد پسندی اور سستی شہرت کی طلب وغیرہ رذائل کی مذمت و ممانعت آئی ہے سب کا تعلق بنیادی طور پر قول و فعل کے تضاد سے ہی ہے۔

صرف یہی نہیں' قرآن و سنت سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قول و فعل میں مطابقت بھی اگر خلوصِ نیت پر مبنی نہیں تو وہ بھی مردود ہے۔ قرآن کریم میں مرضِ قلب' زیغ قلب' رین قلب وغیرہ الفاظ سے باطن کی اسی خرابی کا ذکر ہوا ہے۔ اسلام کے اصولِ اوّلین توحید کے بیان کے لیے قرآن کریم کی جامع ترسورت کا نام ''الاخلاص'' رکھا گیا ہے۔ سورۃ الاسراء میں ایک جگہ نیت کے حسن و قبح کے نتائج یوں بیان ہوتے ہیں:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾﴾

''جو شخص دنیا (کی آسودگی) کا خواہش مند ہو تو ہم اس میں سے جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں پھر اس کے لیے جہنم کو (ٹھکانہ) مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ نفرین سن کر اور (اللہ کی درگاہ سے) راندہ ہو کر داخل ہوگا۔ اور جو شخص آخرت کا خواستگار ہو اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مؤمن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔''

اعمال میں نیت کی خرابی سے واقع ہونے والی بربادی کے بارے میں متعدد احادیث اور عہدِ نبوی کے بعض واقعات بھی سیرت اور حدیث کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔ یہاں صرف ایک قدرے طویل حدیث بیان کی جاتی ہے' جسے مسلم' ترمذی اور نسائی نے روایت کیا

ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ یُقْضٰی یَوْمَ الْقِیَامَۃِ عَلَیْہِ رَجُلٌ اسْتُشْھِدَ فَاُتِیَ بِہٖ فَعَرَّفَہٗ نِعَمَہٗ فَعَرَفَھَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِیْھَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِیْكَ حَتّٰی اسْتُشْھِدْتُ۔ قَالَ: كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِاَنْ یُّقَالَ جَرِیْءٌ فَقَدْ قِیْلَ ، ثُمَّ اُمِرَ بِہٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْھِہٖ حَتّٰی اُلْقِیَ فِی النَّارِ، وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَہٗ وَقَرَاَ الْقُرْآنَ فَاُتِیَ بِہٖ فَعَرَّفَہٗ نِعَمَہٗ فَعَرَفَھَا۔ قَالَ : فَمَا عَمِلْتَ فِیْھَا؟ قَالَ: تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُہٗ وَقَرَاْتُ فِیْكَ الْقُرْآنَ، قَالَ: كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِیُقَالَ عَالِمٌ وَقَرَاْتَ الْقُرْآنَ لِیُقَالَ ھُوَ قَارِئٌ فَقَدْ قِیْلَ ، ثُمَّ اُمِرَ بِہٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْھِہٖ حَتّٰی اُلْقِیَ فِی النَّارِ، وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَعْطَاہُ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّہٖ، فَاُتِیَ بِہٖ فَعَرَّفَہٗ نِعَمَہٗ فَعَرَفَھَا، قَالَ : مَا عَمِلْتَ فِیْھَا؟ قَالَ :مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِیْلٍ تُحِبُّ اَنْ یُّنْفَقَ فِیْھَا اِلَّا اَنْفَقْتُ فِیْھَا لَكَ، قَالَ : كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِیُقَالَ ھُوَ جَوَادٌ فَقَدْ قِیْلَ، ثُمَّ اُمِرَ بِہٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْھِہٖ ثُمَّ اُلْقِیَ فِی النَّارِ)) (۵)

’’قیامت کے دن جن لوگوں کا فیصلہ سب سے پہلے کیا جائے گا ان میں سے ایک وہ شخص ہوگا جس نے (بظاہر) شہادت پائی ہوگی۔ پس اسے لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی وہ نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے عطا کی گئی تھیں اور وہ ان کا اعتراف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا: پس ان کے بارے میں تمہارا عمل کیسا رہا؟ وہ کہے گا: میں نے تیری راہ میں جنگ کی‘ یہاں تک کہ میں نے شہادت پالی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا‘ بلکہ تو نے تو اس لیے جنگ کی تھی تاکہ تجھے بہادر کہا جائے‘ سو وہ (دنیا میں) کہا جا چکا۔ پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا تو اس کو چہرے کے بل گھسیٹتے ہوئے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ دوسرا شخص وہ ہوگا جس نے علم حاصل کیا اور اسے دوسروں کو سکھایا اور قرآن پڑھا۔ پس اسے لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر ہونے والی نعمتیں اسے یاد دلائے گا اور وہ ان کا اعتراف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کہے گا: پس ان کے بارے میں تمہارا عمل کیسا رہا؟ وہ کہے گا: میں نے علم حاصل کیا اور اسے دوسروں کو سکھایا اور میں نے تیری رضا کی خاطر قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا‘ بلکہ

تو نے تو علم اس لیے سیکھا تھا تاکہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن اس لیے پڑھا تھا تاکہ تجھے قاری کہا جائے‘ سو وہ (دنیا میں) کہا جا چکا۔ پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا تو اس کو چہرے کے بل گھسیٹتے ہوئے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ تیسرا شخص وہ ہوگا جسے اللہ تعالیٰ نے رزق میں فراخی عطا فرمائی تھی اور اسے ہر قسم کے مال میں سے حصہ عطا کیا تھا۔ پس اسے لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر ہونے والی نعمتیں اسے یاد دلائے گا اور وہ ان کا اعتراف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا: ان کے بارے میں تمہارا عمل کیسا رہا؟ وہ کہے گا: میں نے کوئی راستہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں خرچ کرنا تجھے پسند ہو مگر میں نے اس میں مال خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا‘ بلکہ تو نے تو یہ اس لیے کیا تھا تاکہ تجھے سخی کہا جائے‘ سو وہ (دنیا میں) کہا جا چکا۔ پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا تو اس کو چہرے کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔‘‘

گویا جہاد‘ تعلیم و تعلّم اور انفاقِ مال ایسے اعمالِ جلیلہ بھی حسنِ نیت اور اخلاص کے بغیر مردود ہیں۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کا ہر عمل اور ہر قول ’’للہ‘‘ اور ’’فی اللہ‘‘ کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ یہاں صرف قول و فعل ہی میں نہیں بلکہ ان کے ساتھ نیت اور اخلاص کی ہم آہنگی بھی ضروری ہے۔

قلب‘ لسان اور جوارح میں سے کسی ایک پرزے کی خرابی‘ کردار و سیرت کی پوری مشینری کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ باقی دنیا کو جانے دیجیے‘ ہم مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانی مسلمانوں کو نبی ﷺ کی لائی اور دی ہوئی تعلیمات کی روشنی میں اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ اپنے قول و فعل کے تضاد کے باعث ہم کس انجام کی طرف رواں دواں ہیں؟ ہم اسلام کو سب سے اعلیٰ و ارفع نظریۂ حیات کہتے ہوئے بھی اسے عملاً آج تک نہ اپنا سکے۔

جب ساری دنیا نے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا اُس وقت ہم نے دین و سیاست کی یکجائی کا نرالا نعرہ بلند کر کے دشمنوں کو تو چوکنا کر دیا اور خود ایک تہائی صدی سے اپنے دین کو سیاست کا تابع مہمل بنانے کی مساعی میں لگے ہوئے ہیں☆۔

لڑ گئے غیر سے مذہب کا لگا کر نعرہ
اور خود اپنے لیے کفر سے نیت باندھی

زندگی کے ہر شعبے میں دین کے اقتدار کے قائل ہوتے ہوئے ہم نے عملاً دین کو پرائیویٹ سے

☆ واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۸۱ء کی ہے۔ افسوس کہ ایک تہائی صدی مزید بیت جانے کے بعد بھی اصلاحِ احوال کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ (مدیر)

بھی کچھ دور تر کر دیا ہے ؎

اتباعِ شریعت کے دعوے بھی ہیں
روح شیدائے تقلید افرنگ بھی!

پاکستان کے اہم رسائل و جرائد خصوصاً جو سرکاری یا نیم سرکاری اہتمام سے چھپتے ہیں' ان میں گزشتہ تیس برسوں میں شائع ہونے والے صرف ''سیرت نمبروں'' میں عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر ایوان ہائے حکومت سے جاری ہونے والے پیغامات اور بیانات کا مطالعہ کیجیے! اللہ اکبر! کیسے کیسے لوگوں نے کیا کیا خوبصورت بیانات دیے! ﴿وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۵۷﴾ (البقرۃ) اور ذرا اسی مدت کے اخبارات کی صرف وہ سرخیاں اور خبروں کے عنوانات جمع کیجیے جن کا آخری حرف کسی ''صیغۂ وعدہ'' کا ''گا' گے' گی'' تھا اور پھر دیکھئے کہ ہم کہتے کیا رہے اور کرتے کیا رہے؟ بوصیری نے سچ کہا تھا:

استغفر اللّٰہ من قول بلا عمل
لقد نسبت بہ نسلاً لذی عقم

آج ہمارے دفاتر میں (الا ماشاء اللہ) خلوص اور محنت سے زیادہ ''خانہ پری'' کا جذبہ کارفرما ہے۔ ہماری تجارت' ہماری برآمدات' ہمارے ٹھیکے اور ٹینڈر' ہماری صنعت و حرفت' ہماری دانش گاہیں حتیٰ کہ خدمت خلق کے ادارے بھی کون سی ایسی جگہ ہے جہاں قول و فعل کا تضاد موجود نہیں ہے' جس چیز کو اللہ عزوجل نے اپنے مقت اور غضب کا نشان بتایا' اسے اپنا کر کیا ہم واقعی کہیں غضبِ الٰہی میں گرفتار تو نہیں ہو گئے؟ اس سے بڑھ کر اور غضب کیا ہوگا؟ کہ کسی کو کسی پر اعتماد نہیں رہا۔ کوئی کسی سے مطمئن نہیں ہے۔ ہماری تقریریں اور وعظ کیوں بے اثر ہو کر رہ گئے ہیں؟ یہ قول و فعل کے تضاد کا زہر ہے جو ہر شے کو برباد کیے جا رہا ہے۔

ہمارے نبی ﷺ' ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے صوفیہ اور صلحاء نے تو اپنے قول و فعل کی ہم آہنگی سے اسلام کو ساری دنیا کے لیے جاذبِ نظر بنا دیا' مگر ہماری یہ حالت ہے کہ اپنے مطالعہ کی بنا پر اسلام کو دین حق سمجھ جانے والے لوگ بھی ہماری صفوں میں داخل ہونے سے گھبراتے ہیں۔

اسلام بذاتِ خود ندارد عیبے
ہر عیب کہ ہست از مسلمانی ماست

اور اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا: ؎

بروں آ از مسلماناں گریز اندر مسلمانی
مسلماناں روا دارند کافر ماجرائی ہا!

آج اجتماعی سطح پر ہماری یہ حالت ہے کہ ؎

راہ بتائیں اور کو آپ پھریں گمراہ
مشعل جن کے ہاتھ میں انہیں نہ سوجھے راہ

اور انفرادی سطح پر اپنی ساری تعلیم و تہذیب اور روشن خیالی کی نمائش کے باوجود عالم یہ ہے کہ:

اُجلے سر کے کیس ہیں من کالک کا ڈھیر
باہر چھائی چاندنی اندر گھپ اندھیر

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض تو اپنے دل کے وسوسوں سے بھی خائف رہتے تھے اور نبی کریم ﷺ سے اپنی اس روحانی اور نفسیاتی الجھن تک کا حل طلب کرتے تھے۔ (بعض اکابر کی احتیاط کے بارے میں مروی ہے کہ وہ وعظ اور تقریر سے گھبراتے اور عذر یہ پیش کرتے: ''**تامرنی ان اقول ما لا افعل فاستعجل مقت اللّٰہ عزّوجل**'' مگر ہماری جسارتوں کا یہ عالم ہے کہ نیت کی باریکیوں اور ضمیر کی گہرائیوں کو چیک کرنا تو درکنار اپنے قول و فعل کے صریح تضاد پر بھی کبھی پشیمان نہیں ہوتے۔ پشیمان ہوں تو توبہ نہ کر لیں کہ توبہ پشیمانی ہی کا تو نام ہے۔ ((اِنَّمَا التَّوْبَةُ النَّدْمُ)) (حدیث)

مسلمان کا سب سے پہلا' سب سے بڑا اور سب سے انقلاب انگیز قول کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ'' کا اعلان ہے۔ جب اس قول کو ہی دل میں جگہ نہ دی' جب اپنے ظاہر و باطن کو اس کے مطابق نہ ڈھالا' جب اپنے عمل اور کردار میں ''الوہیت'' اور ''رسالت'' پر ایمان کے تقاضوں کی کوئی جھلک پیدا نہ کر سکے' جب اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ بھی معاملہ زبانی جمع خرچ تک محدود رہا تو عام انسانوں کے ساتھ قول و فعل کے تضاد میں خرابی کیسے نظر آئے؟ جلسوں جلوسوں کے نعرہ ہائے تکبیر کو چھوڑیے' ہم تو باقاعدہ پانچ وقت اذانوں میں ساری دنیا کے سامنے ''اللہ اکبر'' کا اعلان کرتے رہتے ہیں' مگر ہمارے اعمال و افعال میں اللہ کی کبریائی اور اس کے جلال کا کوئی احساس بصورتِ تقویٰ و خشیت نظر نہیں آتا۔

قول و فعل کے اس تضاد کو دور کرنے یا نہ کر سکنے پر ہی ہمارے دینی ضمیر کی زندگی یا موت

کا دارومدار ہے۔ اگر اس دینی ضمیر میں کوئی خرابی واقع ہوگئی تو پھر سارے ترقیاتی پروگرام مل کر بھی ہمیں برے انجام سے نہیں بچا سکیں گے ؎

دنیا کو تسخیر کر، ذرّے کا دل چیر
لیکن پہلے صاف کر اپنا پاک ضمیر!

قول و فعل کا تضاد جتنا کم ہوتا چلا جاتا ہے اتنا ہی مسلمان اپنی اس اصلی ''منزلِ ترقی و کمال'' سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے، جہاں وہ ''لا الٰہ کی مشکلات'' کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے اور جہاں ہزار خوف بھی اس کی زبان کو دل کا رفیق ہونے سے روک نہیں سکتے۔

حواشی

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی المعاریض۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان.....

(۳) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة النار وانها مخلوقة۔ وصحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب عقوبة من یأمر بالمعروف ولا یفعله وینهی عن المنکر ویفعله۔

(٤) مسند احمد، ح ۱۳۰۲۷۔ مشکاة المصابیح، کتاب الآداب، باب الامر بالمعروف، الفصل الثانی۔

(٥) صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب من قاتل للریاء والسمعة استحق النار۔ وسنن الترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی الریاء والسمعة۔ واللفظ لمسلم۔

[احادیث نبویہ کا اردو ترجمہ قارئین کی سہولت کے لیے ادارہ میثاق کی طرف سے شامل کیا گیا ہے۔]

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت، اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے　　اشاعت عام: 15 روپے

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہج انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک،
اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

صفحات: 375　قیمت اشاعت خاص: 300 روپے　اشاعت عام: 200 روپے

''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

صفحات: 64　قیمت اشاعت خاص: 40 روپے　اشاعت عام: 20 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501

مُذمّتِ بِدعَت (۲)

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ۳۱/ اگست ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

گزشتہ سے پیوستہ

اربعین نووی کی پانچویں حدیث ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ اس حدیث پر کچھ گفتگو پچھلے جمعہ ہوگئی تھی۔ موضوع کی مناسبت سے میں نے سورۃ الحدید کی آیت ۲۷ تلاوت کی تھی، جس میں فرمایا گیا:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۟ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾

''انہوں نے رہبانیت کی بدعت ایجاد کر لی تھی جس کا ہم نے ان کو حکم نہیں دیا تھا مگر (انہوں نے اپنے خیال میں) اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (خود ہی ایسا کر لیا) پھر جیسا اس کو نبھانے کا حق تھا ویسا نباہ نہ کر سکے۔''

قرآن مجید میں ''بدعت'' کا لفظ صرف اسی ایک آیت میں ''رہبانیت'' کے ضمن میں آیا ہے۔ اس ضمن میں، میں نے تفصیل سے بیان کیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہم عصر حضرت یحییٰ علیہ السلام، دونوں پر زہد کا بہت غلبہ تھا۔ انہیں دنیوی لذات سے کوئی سروکار نہ تھا، اس لیے انہوں نے شادی بھی نہیں کی۔ اس کے نتیجے میں ان کے پیروکاروں اور حواریین میں بھی یہی رنگ پیدا ہو گیا اور پھر اگلی نسلوں میں یہ رنگ اور گہرا ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اس نے رہبانیت کی شکل اختیار کر لی —— دین اسلام نے رہبانیت کو ممنوع قرار دیا ہے اور سورۃ الحدید کی مذکورہ بالا آیت میں اس کی نفی کی گئی

ہے۔ رہبانیت کی نفی کے حوالے سے اگرچہ قرآن حکیم میں زیادہ سخت الفاظ نہیں آئے، بلکہ یہ بھی فرمایا گیا: ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾ ''پھر جیسا اسے نبھانے کا حق تھا ویسا نباہ نہ کر سکے''، گویا اس فعل کی مکمل نفی نہیں کی گئی بلکہ اس کا حق ادا نہ کرنے والوں کو تنبیہہ کی گئی ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے خلوصِ نیت کے ساتھ رہبانیت کو اپنایا تھا۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں واقعتاً ایسے لوگ تھے جنہوں نے رہبانیت کا حق ادا کیا لیکن بعد میں اکثر و بیشتر لوگ اس کی پابندی نہیں کر پائے۔ البتہ احادیثِ مبارکہ میں بڑی شدت کے ساتھ رہبانیت کی نفی آئی ہے۔ اس ضمن میں چند احادیث مبارکہ میں آپ کو سنا چکا ہوں، ان میں ایک طویل روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے عبادات میں غلو کا عہد کر لیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ان سے اعلان براءت کرتے ہوئے آخر میں فرمایا: ((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)) ''جسے میری سنت (طریقہ) پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ اب یہ بہت سخت انداز ہے۔ حالانکہ انہوں نے جو بھی سوچا اور جو بھی عہد کیا تھا وہ نیک نیتی پر مبنی تھا، لیکن اس کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے طرزِ عمل کی نفی میں بہت غیر معمولی الفاظ ارشاد فرمائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رہبانیت کی مثال آپؐ کے سامنے تھی جو نیک نیتی سے شروع ہوئی لیکن بالآخر راہب خانے برائیوں کی آماجگاہ بن گئے۔

اس ضمن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی ایک اور روایت ملاحظہ ہو —— حضرت انسؓ جب ۹ یا ۱۰ برس کے ہوئے تو ان کی والدہ ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی اور کہا کہ یہ آپؐ کے پاس رہے گا اور عمر بھر آپؐ کی خدمت کرے گا۔ اُس دن سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ دنیوی کے اختتام تک حضرت انسؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیے —— وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے:

((لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ فَيُشَدَّدَ عَلَيْكُمْ ، فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ، فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ))[1]

''(دیکھو) اپنے اوپر سختی مت کرو (اگر تم اپنے اوپر سختی کرو گے) تو تم پر سختی ہی کی

جائے گی۔ پس پہلی قوموں میں سے جنہوں نے اپنے آپ پر سختی کی تو اللہ نے بھی ان کو سختی میں مبتلا کر دیا۔ پس اُن کی باقیاتِ سیئات خانقاہوں اور راہب خانوں میں موجود ہیں۔''

اس کے بعد آپؐ نے سورۃ الحدید کی آیت ۲۷ تلاوت فرمائی جس کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ ''اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں''۔ یعنی اکثر ایسے تھے جنہوں نے رہبانیت کا حق ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے فطرت کے ساتھ تصادم کا راستہ اختیار کیا اور فطرت کے تقاضوں کے خلاف غیر فطری قدغنیں لگا دیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ اللہ نے انسان کے اندر جو تقاضے رکھے ہیں وہ انسان کو پچھاڑ دیتے ہیں اور پھر انسان منہ کے بل بری طرح گر پڑتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا الوداعی وعظ اور وصیت

موضوع کی مناسبت سے اب میں آپ کو ایک بڑی اہم حدیث[2] سنا رہا ہوں — اس حدیث کی اہم بات یہ ہے کہ اس کو سن کر نبی اکرم ﷺ کی محفل کا نقشہ کچھ دیر کے لیے ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ اس سے پہلے حدیثِ جبریل کے مطالعہ کے دوران ہم اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ اس کو پڑھ کر بھی حضور اکرم ﷺ کی محفل کا نقشہ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے — حضرت عرباض بن ساریہ ؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے: فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيغَةً ''پھر آپؐ نے ایک ایسا وعظ فرمایا جو دلوں میں اتر جانے والا تھا''۔ یعنی ایسا وعظ فرمایا کہ وہ ہمارے دلوں میں سرایت کر گیا۔ ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُونُ ''(اس کی تاثیر اس درجے میں ہوئی کہ) اس سے ہماری آنکھیں بہہ پڑیں''۔ یعنی ہماری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوبُ ''اور ہمارے دل دہل گئے''۔ اس صورت حال میں ایک شخص نے عرض کیا: يَا رَسُولَ

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد۔

(۲) سنن الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ وسنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة۔ واللفظ له۔

اللّٰهِ! كَأَنَّ هٰذِهِ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَمَاذَا تَعْهَدُ إِلَيْنَا ''اے اللہ کے رسول ﷺ! (ایسا محسوس ہو رہا ہے) یہ تو گویا وداع کرنے والے کا وعظ ہے۔ پس آپؐ ہم سے کس چیز کا عہد لینا چاہتے ہیں؟'' ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا آخری وعظ ہے، بالفاظِ دیگر یہ آپؐ کی وصیت ہے۔ اس درجے کا بلیغ اور مؤثر وعظ کہ سننے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہنے لگے اور دلوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ مسند احمد کی روایت میں ''فَأَوْصِنَا'' کے الفاظ ہیں۔ یعنی اس صحابیؓ نے کہا کہ اگر واقعی آپؐ کی اس دنیا سے رخصتی کا وقت قریب آ گیا ہے تو پھر ہمیں وصیت فرمائیے اور وہ باتیں بتائیے جن کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

اس سے آگے رسول اللہ ﷺ کا فرمان شروع ہو رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((أُوصِيكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ)) ''میں تمہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں'' — آگے بڑھنے سے پہلے تقویٰ کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اس حیاتِ دُنیوی میں معصیت سے بچنا، گناہوں سے بچنا، اللہ کی نافرمانی سے بچنا، حدودِ شریعت تجاوز کرنے سے بچنا اور تمام خرافات، رسومات و بدعات سے بچنا تقویٰ کہلاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ انسان کو کسی گھنے جنگل میں سے گزرنا پڑے اور وہاں نہ کوئی پگڈنڈی ہو، نہ کوئی راستہ ہو، بلکہ اونچی اونچی گھاس اور گھنے درخت ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے میں انسان بہت چوکنا ہو کر پھونک پھونک کر قدم رکھے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو یا کسی اور موذی جانور کا بل یا بھٹ ہو اور وہاں پاؤں پڑ جائے۔ ایمیزون یا کانگو جیسے جنگلات میں تو درختوں سے لٹکے ہوئے سانپ بھی موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح پوری زندگی انسان کا معصیتِ الٰہی سے بچ کر چلنا تقویٰ ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا!

تقویٰ کی وصیت کے بعد آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ)) ''(تقویٰ کے ساتھ ساتھ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں) سمع و طاعت یعنی سننے اور حکم

ماننے کی‘‘ — یعنی میں تو اللہ کا رسول ہوں اور تم میری بات مان رہے ہو‘ لیکن میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی‘ میرے بعد تو خلفاء ہوں گے۔ اس لیے میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ ان کا حکم سننا اور ماننا اور اپنی جماعتی زندگی میں رخنے نہ پڑنے دینا۔ گویا: "United you stand, divided you fall" یعنی تم متحد رہو گے تو سربلند رہو گے اور جب تم تقسیم ہو جاؤ گے تو تمہیں زوال آجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب مسلمان شیعانِ عثمانؓ اور شیعانِ علیؓ کے نام سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تو پھر مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تو پورا عہد خلافت خانہ جنگی کی نذر ہو گیا اور ایک لاکھ کے قریب مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں‘ تیروں اور نیزوں سے ختم ہو گئے۔ ظاہر بات ہے پھر زوال تو شروع ہونا ہی تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ عَبْدًا حَبَشِيًّا)) ’’(میں تمہیں وصیت کرتا ہوں خلیفہ اور امام کا) حکم سننے اور ماننے کی خواہ وہ ایک حبشی غلام ہی ہو‘‘۔ یعنی یہ نہ سمجھنا کہ تم برتر اور اعلیٰ ہو جبکہ وہ ادنیٰ اور کم تر ہے‘ بلکہ تمہارا خلیفہ یا امام حبشی غلام بھی ہو تو بھی تم پر اس کی اطاعت لازم ہے۔

آگے آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَاِنَّهٗ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا)) ’’اس لیے کہ تم میں سے جو بھی میرے بعد زندہ رہے گا وہ کثرت کے ساتھ اختلاف دیکھے گا‘‘۔ اختلاف تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی ہوا‘ جیسے مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد کے بارے میں اور لشکر اسامہ کی روانگی اور پھر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی امارت کے حوالے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف رائے ہو گیا تھا‘ لیکن پھر جو فیصلہ ہوا اسے سب نے تسلیم کیا۔ بہرحال ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ انسانی معاملات میں اختلاف نہ ہو‘ لیکن اگر اختلاف میں شدت آجائے اور اپنی بات منوانے پر سارا زور ہو جائے تو پھر زوال کی جانب سفر شروع ہو جاتا ہے۔ اگر ہر صاحب الرائے اپنی رائے پر اڑ جائے اور اسی کو اچھا سمجھے تو پھر جماعت کا نظم کیسے چلے گا۔ ایک حدیث میں ’’اِعْجَابُ كُلِّ ذِيْ رَأْيٍ بِرَأْيِهٖ‘‘ کو ’’مہلکات‘‘ میں سے شدید ترین قرار دیا گیا

ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جماعت میں بعض اوقات اپنی رائے کو پسِ پشت ڈال کر امیر کی رائے کو ماننا پڑتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس وداعی وعظ میں تقویٰ اور سمع وطاعت کی خصوصی وصیت فرمائی۔

حدیث کا آخری ٹکڑا ہمارے آج کے موضوع ’’مذمت بدعت‘‘ سے متعلق ہے۔ آپؐ نے اپنی وصیت کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّيْنَ الرَّاشِدِيْنَ ‘ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ)) ’’پس تم پر میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی پیروی لازم ہے‘ تو تم اس کو لازم پکڑو اور اس کو اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ کر رکھو‘‘ — کچلیوں کے دانت (نواجذ) کسی چیز کو پکڑنے کے لیے ہوتے ہیں۔ درندوں میں یہ کچلیاں (canines) اسی لیے لمبی ہوتی ہیں کہ انہوں نے زندہ جانور کے گوشت کو پھاڑنا ہوتا ہے اور کچلیاں ہی اس کام کے لیے کارگر ہوتی ہیں۔ آگے کے دانت چیر پھاڑ کرنے کا یہ کام نہیں کر سکتے۔

آگے فرمایا: ((وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ‘ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ ‘ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ’’اور دیکھو ہرگز نئے پیدا ہونے والے معاملات کی پیروی نہ کرنا‘ اس لیے کہ ہر نئی پیدا شدہ چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی کا باعث ہے۔‘‘

بدعت کا تیسرا سبب: اقامتِ دین کی جدّوجُہد اور جہاد سے پہلوتہی

بدعت کے اسباب کے حوالے سے یاد رکھیں کہ جب دین کا ہمہ گیر تصور سامنے نہیں رہتا تو بدعات پیدا ہوتی ہیں۔ دین کے ہمہ گیر تصور میں عبادات بھی ہیں اور معاملات بھی‘ البتہ عبادات کی نسبت معاملات کی اہمیت زیادہ ہے۔ عبادات کی کوتاہی کو تو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا‘ اس لیے کہ وہ تو اللہ کے لیے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو بہت معاف فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ لیکن اس کے برعکس معاملات کی کوتاہی کو اللہ تعالیٰ از خود معاف نہیں کرے گا‘ اس لیے کہ یہ انسانوں کا حق ہے۔ اگر آپ نے کسی کا حق مارا ہے تو اس کا حساب کتاب ہو کر رہے گا۔ یا تو اس کے کچھ گناہ آپ کے حصے میں آئیں گے یا آپ کی کچھ نیکیاں اس کو دے دی جائیں گی جس کا آپ نے حق مارا ہے

—— میں نے بتایا تھا کہ بدعت کا دوسرا سبب روحِ عبادت کا ختم ہو جانا ہے اور یہ نیک نیتی سے نہیں‘ بلکہ جہالت اور غفلت کی بنا پر ہوتا ہے۔

اب بدعت کے تیسرے سبب کی طرف آتے ہیں اور وہ ہے اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد یعنی جہاد فی سبیل اللہ سے کنارہ کشی اختیار کرنا۔ ہم ان نشستوں میں ’’حکمتِ دین کا عظیم خزانہ‘‘ کے عنوان سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مطالعہ کر چکے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کو دین اسلام کی بلند ترین چوٹی قرار دیا ہے۔ اس طویل حدیث میں وارد رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ ذہن میں تازہ کیجیے:

((اِنَّ رَأْسَ هٰذَا الْاَمْرِ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ، وَاَنَّ قِوَامَ هٰذَا الْاَمْرِ اِقَامُ الصَّلَاةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكَاةِ وَاَنَّ ذِرْوَةَ السَّنَامِ مِنْهُ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (۱)

’’یقیناً دین کی جڑ یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ کوئی معبود نہیں سوائے تنہا اللہ تعالیٰ کے جس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور اس دین کو قائم رکھنے والی اور اس کی شیرازہ بندی کرنے والی چیز ہے نماز کو قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا۔ اور اس کی بلند ترین چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔‘‘

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے گویا اسلام کو ایک درخت سے تشبیہہ دی ہے جس کی جڑ ہے اللہ تعالیٰ کے وحدہٗ لاشریک اور محمد ﷺ کے آخری نبی ہونے کی گواہی دینا‘ اس کا تنا اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے‘ جبکہ اس کی چوٹی ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘ ہے —— آپ کو معلوم ہے کہ اصل مطلوب تو درخت کی چوٹی ہوتی ہے جس پر پھل لگتا ہے۔ اس طرح اسلام کی چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے جو اللہ کے نظام کو غالب کرنے کا ایک ذریعہ ہے‘ لیکن موجودہ دور میں کچھ لوگوں کی زندگی سے جہاد خارج ہو چکا ہے۔ انہیں تصور ہی نہیں کہ جہاد بھی کوئی فرض ہے۔ یہ لوگ تو باطل کے نظام میں بڑی آسودگی سے رہتے ہوئے اپنے کاروبارِ دنیا میں مگن ہیں۔ انہیں اس سے غرض ہی نہیں کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے‘ اللہ کے دین کی دھجیاں کس طرح بکھیری جا رہی ہیں‘ شریعت کو کیسے پامال کیا

(۱) مسند احمد‘ ح ۲۱۸۳۰

جا رہا ہے‘ دین میں کیسی تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ لہٰذا جب اقامتِ دین کی جدوجہد خارج از بحث ہو گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا تصورِ دین سکڑ کر رہ گیا۔

بدعت کا چوتھا سبب: معاملات میں اَحکامِ الٰہیہ سے روگردانی

کچھ لوگ وہ ہیں جو معاملات میں بھی دین کے احکام کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کاروبار میں سود لینا دینا پڑتا ہے‘ بینک سے سودی قرض لیے بغیر کاروبار نہیں چلتا‘ چھوٹے مکان کو بڑی حویلی میں تبدیل کرنے کے لیے بینک سے قرضہ لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح باقی معاملات میں وعدہ خلافی ہو رہی ہے‘ جھوٹ بولا جا رہا ہے‘ دھوکہ دہی چل رہی ہے‘ ملاوٹ عروج پر ہے‘ وغیرہ وغیرہ۔ جب معاملات کے اندر بھی کمی ہو گئی تو اب سارا گاڑھا پن عبادات میں آ گیا۔ اس کے لیے میں نے آپ کو مثال دی تھی کہ اگر آپ ایک طشت میں پانی ڈالتے ہیں تو اس پانی کی اونچائی ایک انچ یا دو انچ ہو گی اور اگر اسی پانی کو آپ کسی جار یا بوتل میں ڈال دیں تو وہ ایک فٹ اونچا ہو جائے گا۔ اسی طرح دین کے معاملہ میں جب آپ نے اس کی بنیاد (base) کو تنگ کر دیا بایں طور کہ نہ اقامتِ دین کی جدوجہد رہی اور نہ معاملات کی احکامِ الٰہی کے مطابق پیروی رہی‘ تو پھر سارا زور عبادات پر چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر سال عمرہ اور حج ہو رہا ہے‘ لیکن اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کمائی حرام کی ہے یا حلال کی۔ کچھ لوگ تو بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ میں ہر سال حج کو جاتا ہوں اور میرا مصلّٰی تو مسجد حرام اور مسجد نبوی کی پہلی صف کے اندر مقرر ہے۔ یہ لوگ وہاں شُرطوں کو رشوت دے کر اپنے مصلّے پہلی صفوں میں رکھواتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بڑی نیکی کا کام کر رہے ہیں۔

اس حوالے سے آپ نبی آخر الزماں ﷺ کا طرزِ عمل دیکھیں کہ آپؐ نے عمرۂ قضا جو صلح حدیبیہ کے بعد ہوا‘ کے بعد باقی ساری زندگی کوئی عمرہ نہیں کیا‘ حالانکہ ۸ ہجری میں مکہ فتح ہو گیا اور آپؐ کو عرب کے بادشاہ کی حیثیت حاصل ہو گئی‘ اگر عمرہ کرنا چاہتے تو کوئی روکنے والا نہیں تھا‘ لیکن آپؐ نے کوئی عمرہ نہیں کیا بلکہ آپؐ نے ساری جدوجہد دین کو غالب کرنے کے لیے کی اور اپنا سارا وقت اس کام میں لگایا۔ اسی طرح رسول

اللہ ﷺ نے ایک حج کے علاوہ ساری زندگی کوئی حج نہیں کیا' حالانکہ رمضان المبارک ۸ ہجری کو مکہ فتح ہو چکا تھا' آپؐ چاہتے تو اس سال حج کر سکتے تھے لیکن آپؐ حج کیے بغیر مدینہ واپس آ گئے۔ پھر ۹ ہجری میں بھی آپؐ نے خود حج نہیں کیا بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج مقرر کر کے حجاج کا قافلہ مدینہ سے روانہ کر دیا۔ آپؐ نے ساری زندگی میں صرف ۱۰ ہجری کو حج کیا' جسے ہم ''حجۃ الوداع'' کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اس طرزِ عمل سے ہمیں سمجھنا چاہیے کہ دین میں مختلف عناصر کے درمیان کیا نسبت و تناسب (ratio proportion) ہے اور کون سی چیز کتنے درجے میں مطلوب ہے۔ لیکن جب اس چیز کا خیال نہیں رکھا جائے گا اور سارا زور صرف عبادات تک محدود ہو جائے گا تو پھر عبادات کے معاملے میں اپنے اوپر سختی بھی ہو گی' مبالغہ بھی ہو گا' یہاں تک کہ پھر بدعات ایجاد ہو جائیں گی۔

اس ضمن میں آپ دیکھیں کہ ہمارے ہاں خاص طور پر شب براءت کے حوالے سے یہ تصور ہے کہ اس رات میں زیادہ سے زیادہ عبادت کا اہتمام کیا جائے —— اس کے علاوہ اس رات جو آتش بازی یا جشن اور ہنگامہ ہوتا ہے اس کا تو سرے سے دین سے کوئی سروکار ہے ہی نہیں —— عبادت کے لیے بھی خاص طور پر اس رات کو مقرر کر لیا گیا ہے' حالانکہ اس رات کی فضیلت کے حوالے سے کوئی قوی احادیث موجود نہیں ہیں۔ اسی طریقے سے شب معراج کا معاملہ ہے۔ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ پوری توجہ اب عبادات پر مرتکز ہو چکی ہے اور سارا زور عبادات پر ہی صرف ہو رہا ہے۔

بدعات کا نتیجہ: اختلافات اور رسومات کی کثرت

عبادات کے دو پہلو ہیں' ایک ہے ان کا ظاہر اور رسم' جبکہ ایک ہے باطن اور روح۔ مثلاً نماز کا ظاہری پہلو یہ ہے کہ آپ نے اللہ اکبر کہتے ہوئے ہاتھوں کو کانوں تک اٹھایا اور پھر ہاتھ باندھ دیے' ثنا پڑھی' فاتحہ پڑھی اور قرآن کا کچھ حصہ پڑھا' رکوع میں گئے' تسبیحات پڑھیں' پھر کھڑے ہو گئے' پھر سجدے میں گئے' تسبیحات پڑھیں' پھر بیٹھے' پھر سجدے میں گئے' پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر اگلی رکعت اسی طرح بغیر ثنا کے پڑھی۔

پھر قعدہ میں بیٹھے اور سلام پھیر دیا۔ یہ سارا عمل رسمِ نماز اور نماز کی ظاہری شکل ہے۔ نماز کا باطنی پہلو یہ ہے کہ نماز کو خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھا جائے' قراءت کے وقت آیات پر غور کیا جائے —— بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہ کیفیت تھی کہ قراءت کے دوران جب جہنم یا عذابِ جہنم کا تذکرہ آتا تو آنکھیں بہہ پڑتیں' رقت طاری ہو جاتی —— دورانِ نماز اپنے اندر احسان کی کیفیت پیدا کی جائے جس کا ذکر حدیث جبریل میں بایں الفاظ ہوا ہے: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ' فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''(احسان یہ ہے کہ) تو اللہ تعالیٰ کی عبادت یوں کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے' اور اگر یہ مقام حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ خیال تو رہے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے'' —— اب ہوا یوں کہ جب سارا زور صرف عبادات پر آ گیا تو نماز کا باطنی اور روحانی پہلو تو ختم ہو گیا' بس رسم اور ظاہری پہلو باقی رہ گیا۔ بقول اقبال ؎

رہ گئی رسمِ اذاں' روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا' تلقینِ غزالی نہ رہی!

جب روحِ دین اور روحِ عبادت سے توجہ ہٹ جائے گی تو دین کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلاف ہو گا اور ''من دیگرم تو دیگری'' کی نوبت آ جائے گی۔ آپ اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ آمین بِالجہر اور بِالسِّر کہنے والوں اور رفع یدین کرنے اور نہ کرنے والوں میں لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ بعض جگہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص بھول کر دوسرے مکتبہ فکر کی مسجد میں چلا جائے تو اسے کہا جاتا ہے کہ ہماری مسجد میں کیوں آئے ہو؟ اگر آئندہ آئے تو ٹانگیں توڑ دیں گے۔ اللہ کی پناہ! کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنیاد پر مسجدیں الگ بنا لیں' ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے' لیکن دین کے بڑے معاملات (سود' جھوٹ' حرام کمائی' ملاوٹ' دھوکہ دہی وغیرہ) کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بولتا' وہاں تو لکڑ ہضم' پتھر ہضم والا معاملہ ہے۔

عبادات پر ساری توجہ مرتکز ہونے کا ایک نتیجہ تو یہ اختلافات ہیں' جبکہ اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ رسومات زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کی ایک مثال شادی بیاہ

کا موقع ہے۔ ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کے لیے اَن گنت رسمیں رائج ہوگئی ہیں۔ اس حوالے سے یاد رکھیں کہ شادی کے موقع پر لڑکی والوں کے ہاں کسی دعوتِ طعام کا ثبوت احادیث اور اسلامی تاریخ میں نہیں ملتا۔ پوری شادی میں صرف ایک دعوتِ طعام ہے اور وہ لڑکے کی طرف سے دعوتِ ولیمہ ہے۔ اس کی بھی وجہ ظاہر ہے کہ اس کا گھر آباد ہوا ہے تو وہ خوشی منائے اور اپنے دوستوں کو اس خوشی میں شریک کرے —— دعوت ولیمہ نہ صرف ثابت ہے بلکہ اس کی تاکید بھی ہے۔ احادیث کی کتابوں میں ''باب الولیمہ'' کے عنوان سے پورا پورا باب موجود ہے —— ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ پہلے لڑکی دیکھنے کے لیے ایک پورا لشکر جاتا ہے اور لڑکی والوں کو بادلِ نخواستہ طعام کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کرنا پڑتا ہے' پھر منگنی کی باری آتی ہے' پھر تاریخ مقرر کرنے کی' پھر تیل اور مایوں کی' پھر مہندی کی۔ ان تمام رسومات میں سے اکثر کا بوجھ لڑکی والوں پر پڑتا ہے اور انہیں ہر تقریب میں دعوتِ طعام کا انتظام کرنا پڑتا ہے تاکہ لڑکی کو سسرال میں طعنے نہ سننے پڑیں۔ یہ سب تو وہ رسومات ہیں جو شادی کے دن سے پہلے کی ہیں۔ جب شادی کا دن آتا ہے تو پہلے سہرا بندی ہوتی ہے' دولہے کو سلامیاں پیش کی جاتی ہیں' پھر بارات کا لشکر لڑکی والوں کے ہاں جاتا ہے اور وہاں نکاح ہوتا ہے۔ وہاں بھی دولہا میاں سلامیاں وصول کرتے ہیں۔ نکاح کے بعد وہاں دعوتِ طعام کا عظیم الشان اہتمام ہوتا ہے جس میں اسراف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے اور پھر بہت سا کھانا برباد بھی کر دیا جاتا ہے۔

جن لوگوں کے پاس روپے پیسے کے انبار ہیں وہ تو اپنی دولت کے اظہار اور نمود و نمائش کے لیے یہ ساری رسومات ادا کرتے ہیں —— قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کا نام تبذیر ہے: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ﴾ (بنی اسرائیل:۲۷) ''اپنے نام و نمود کے لیے خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں'' —— اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک غریب آدمی کو بھی دیکھا دیکھی یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ اب یہ اس کا دردِ سر ہے کہ وہ اس کے لیے کہیں چوری کرے' ڈاکہ ڈالے یا رشوت لے' لیکن اسے ہر حال میں یہ کرنا ہے' ورنہ بیٹی کیا سوچے گی کہ میری شادی پر میرا باپ یہ بھی نہ کر سکا! یہی وہ خرافات

ہیں جن کی وجہ سے ان لوگوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں جن کے ہاں چند بیٹیاں پیدا ہو جائیں۔ اس حوالے سے اسلام کا اصول یاد رکھیں کہ شادی میں لڑکی والوں کا ایک پیسہ بھی نہیں خرچ ہونا چاہیے۔ مہر' محفل نکاح میں منہ میٹھا کرانا اور پھر دعوتِ ولیمہ' یہ سب لڑکے والوں کی ذمہ داری ہے' لڑکی والوں کا تو سرے سے کوئی خرچ ہے ہی نہیں۔ جہیز کے حوالے سے بھی یہ نوٹ کر لیں کہ اس کا اسلام میں سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے' لیکن ہمارے ہاں سارا معاملہ الٹ ہے۔ اس کی وجہ ایک بار پھر نوٹ کر لیں کہ جہاں کوئی بدعت آ جاتی ہے وہاں سے کوئی سنت غائب ہو جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ)) (۱)

''جو قوم بھی کوئی بدعت ایجاد کرتی ہے تو اس کی جگہ سے سنت اٹھالی جاتی ہے۔ پس سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔''

احیاءِ سنت بمقابلہ ایجادِ بدعت

موضوع کی مناسبت سے میں ایک اور حدیث آپ کو سنانا چاہتا ہوں تاکہ یہ مسئلہ اچھے طریقے سے واضح ہو جائے۔ حضرت بلال بن حارث المزنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّهٗ مَنْ اَحْيَا سُنَّةً مِنْ سُنَّتِیْ قَدْ اُمِيْتَتْ بَعْدِیْ فَاِنَّ لَهٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ اَنْ يَنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا)) (۲)

''یقیناً جس شخص نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد مردہ ہو چکی تھی تو اس شخص کو اتنا اجر ملتا رہے گا جتنا اس سنت پر عمل کرنے والے کو ملے گا اور عمل کرنے والے کے اجر میں کوئی کمی بھی نہیں ہوگی۔''

یعنی جس نے کسی مردہ سنت کو دوبارہ زندہ کیا تو اس کے حساب میں تمام عمل کرنے والوں

(۱) مسند احمد' کتاب مسند الشامیین' باب حدیث عضیف بن الحارث رضی اللہ عنہ' ح ۱۶۳۵۶۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب العلم' باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدعة۔

جتنا ثواب کریڈٹ ہوتا رہے گا۔ اب دیکھئے ہم نے مسجد میں نکاح کی سنت کو از سرِ نو زندہ کیا ہے' حالانکہ لوگ تو اسے ہتک اور توہین سمجھتے تھے۔ اسی طرح ہم نے جماعتی زندگی میں بیعت کی سنت کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ ہمارے ہاں تو مغرب سے آیا ہوا نظام مسلط کر دیا گیا کہ ووٹ کے ذریعے صدر کو منتخب کرو' حالانکہ اسلام میں تو بیعت کا نظام ہے اور اسی کے ذریعے خلفاء کا چناؤ ہوا ہے۔ تیرہ سو برس کی اسلامی تاریخ میں بیعت کے علاوہ کسی اور طریقہ کا نشان تک نہیں ہے۔ خلافت بھی بیعت کی بنیاد پر ہے اور ملوکیت بھی۔ بنواُمیہ اور بنوعباس کے خلفاء بھی بیعت لیتے تھے۔ پھر جب مغربی استعمار کا دور آ گیا تو اس کے خلاف جو بھی عسکری تحریکیں اُبھریں وہ بھی بیعت کی بنیاد پر بنی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں سید احمد شہید کی تحریک شہیدینؒ' لیبیا میں سنوسی تحریک' سوڈان میں مہدی سوڈانی کی تحریک اور روس میں امام شامل کی تحریک' سب میں نظم کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ عہدِ ملوکیت میں جب مذہب و سیاست میں تقسیم نمایاں ہونے لگی تو ہمارے ہاں ''بیعتِ ارشاد'' وجود میں آئی۔ بہرحال یہ ایک اچھی بات تھی کہ لوگوں کو اللہ کا کلمہ سکھا دینا' کوئی اچھی بات بتا دینا یا نیکی کی تلقین کر دینا ـــــ لیکن اجتماعی زندگی کے حوالے سے بیعت کی سنت تقریباً مردہ ہو چکی تھی اور یہ اللہ کا ہم پر خصوصی فضل ہے کہ اس نے ہمیں بیعت کے نظام کو از سرِ نو زندہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

حدیث کے اس حصے میں تو احیاءِ سنت کی فضیلت کا بیان تھا' جبکہ روایت کے اگلے حصہ میں بدعت ایجاد کرنے والے کے انجامِ بد کا تذکرہ ہے۔ آگے آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةَ ضَلَالَةٍ لَا تُرْضِي اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كَانَ عَلَيْهِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اَوْزَارِ النَّاسِ شَيْئًا)) ☆

☆ اس مضمون سے ملتی جلتی ایک روایت امام مسلم نے بھی نقل کی ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

((مَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهٗ كُتِبَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يَنْقُصُ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهٗ كُتِبَ عَلَيْهِ مِثْلُ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يَنْقُصُ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ)) (صحیح مسلم' کتاب العلم' باب من سن سنة حسنة او سيئة .....)

◀◀

''اور جس شخص نے کوئی گمراہی والی بدعت ایجاد کی جو اللہ اور اُس کے رسول کو ناپسند ہو تو اس شخص کو بھی اتنا ہی گناہ ملے گا جتنا اس بدعت پر عمل کرنے والوں کو ملے گا (یعنی جتنے لوگ بھی اس بدعت کو کریں گے اس کے برابر گناہ بدعت ایجاد کرنے والے کے حساب میں درج ہوتا رہے گا) اور اس بدعت پر عمل کرنے والے لوگوں کے اپنے بوجھ میں سے کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

بدعت اور بدعتی کی توقیر کی مذمت

اس ضمن میں ایک مرسل حدیث ملاحظہ ہو جسے امام بیہقیؒ نے اپنی کتاب ''شعب الایمان'' میں نقل کیا ہے:

((مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ)) (۱)

''جس شخص نے کسی بدعتی کی توقیر کی تو اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں اس کی مدد کی۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کسی فاسق کی مدح سرائی کو اللہ کے غضب کا باعث قرار دیا۔ امام بیہقیؒ ''شعب الایمان'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث نقل کرتے ہیں:

((اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ تَعَالٰى وَاهْتَزَّ لَهُ الْعَرْشُ)) (۲)

''جب کسی فاسق کی مدح سرائی کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس درجے غضب ناک ہوتا ہے کہ اس کا عرش کانپ اٹھتا ہے۔''

بدعات' رسومات اور نئی نئی ایجادات اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں'

◀◀ ''جس نے اسلام میں کسی نیک کام کو جاری کیا اور بعد میں لوگوں نے اس پر عمل بھی کیا تو اس شخص کو ہر عمل کرنے والے کے بقدر ثواب ملے گا اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں سے بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور جس نے اسلام میں کسی برے کام کو جاری کیا اور بعد میں لوگوں نے وہ کام کیا بھی تو اس شخص پر ہر عمل کرنے والے کے بوجھ (گناہ) کے بقدر بوجھ ہوگا اور کرنے والوں کے بوجھ میں سے بھی کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔'' (اضافہ از مرتب)

(۱) مشکاة المصابیح' کتاب الایمان' باب الاعتصام بالکتاب والسنة' الفصل الثالث۔

(۲) مشکاة المصابیح' کتاب الآداب' باب حفظ اللسان والغیبة والشتم' الفصل الثالث۔

لہٰذا ہمیں ایک اصول طے کر لینا چاہیے کہ جو چیز قرآن وسنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے وہ سر آنکھوں پر (مثلاً شادی بیاہ میں دعوت ولیمہ) اور جو ثابت نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کہیں باہر سے آئی ہوئی چیز ہے' اس لیے اس کو چھوڑ دیا جائے اور اس پر عمل کر کے اللہ کے غضب کو دعوت نہ دی جائے۔ مثلاً جہیز کا کوئی تصور سرے سے اسلام میں ہے ہی نہیں' بلکہ اس کا ایک ہندوانہ پس منظر ہے۔ ہندوؤں میں لڑکی کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا' اس لیے جب وہ اپنی لڑکی کو گھر سے رخصت کرتے ہیں تو کچھ دان دہیج دے کر رخصت کرتے ہیں کہ جاؤ اب تمہارا اس گھر سے کوئی سروکار نہیں' ہماری وراثت میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں تو لڑکی باقاعدہ وارث ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں بھی ہندوؤں کے دیکھا دیکھی بیٹی کو جہیز دے کر عام طور پر وراثت سے فارغ کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑی مثال ہے اس بات کی کہ جہاں بدعت آئی وہاں سنت غائب ہوگئی' یعنی جہیز دے دیا اور وراثت کے قرآنی حکم کو پسِ پشت ڈال دیا' جس کے بارے میں قرآن میں الفاظ آئے ہیں: ﴿..... مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝۷﴾ یعنی ترکہ خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ اسے وارثوں میں تقسیم کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا گیا حصہ ہے۔

بدعات سے بچنے کا فارمولا

مذمت بدعت کے حوالے سے میں نے کئی احادیث پچھلے خطابِ جمعہ اور آج کے خطاب میں بیان کی ہیں۔ ان احادیث کی روشنی میں ہمیں بدعات اور محدثات الامور سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے۔ چیزوں کو پرکھنے کے لیے میں نے آپ کو ایک فارمولا بتا دیا کہ پہلے یہ تلاش کیجیے کہ یہ کام قرآن وسنت سے ثابت ہے یا نہیں۔ اگر ثابت ہے تو پھر یہ دیکھیں کہ کس درجے میں مطلوب ہے' دین میں یہ کس نسبت وتناسب کے ساتھ ثابت ہے۔ اگر آپ ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھیں گے تو ان شاء اللہ آپ بدعت سے بچ جائیں گے۔ یاد رکھیں کہ کینسر بھی ہمارے جسم کا ایک ٹشو ہی ہوتا ہے جو غیر متناسب طور پر (out of proportion) بڑھنا شروع کر دیتا ہے اور

اس طرح وہ ہمارے جسم کے بیرونی سطح پر گلٹی کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے یا پھر جسم کے اندر رہتے ہوئے جسم کے باقی ٹشوز کو کھاتا رہتا ہے اور پھر بالآخر انسان موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ ہمارے دین کا ہے۔ اگر آپ دین کے کسی معاملہ پر غیر متناسب طور پر عمل کریں گے تو یہ دین کا کینسر بن جائے گا۔ لہٰذا سنت سے ثابت شدہ چیزوں پر بھی توازن اور اعتدال کے ساتھ عمل کرنا چاہیے۔ سنت کی پیروی صرف اس کا نام نہیں ہے کہ جو چیز احادیث سے ثابت ہے بس اس پر عمل کر لیا' بلکہ اس کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر عمل تھا۔ اگر آپ اس کے مطابق عمل کریں گے تو پھر سنت کا صحیح حق ادا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ کام جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی گزار دی یعنی اقامتِ دین کی جدوجہد اس کو تو ہم نے اپنے ذہنوں سے خارج کر رکھا ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی سنت ہے' لیکن ہم نہ تو اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہ باقی معاملات پر دین کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔ معاملات میں تو ہم حیلوں بہانوں سے ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ سود کے حوالے سے کہہ ڈالتے ہیں کہ کیا کریں اس کے بغیر کاروبار چلتا ہی نہیں ہے۔ وکلاء حضرات جھوٹ بولنے کی توجیہہ یہ پیش کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں قانون ایسا ہے کہ صحیح سے صحیح مقدمہ بھی جھوٹ کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا۔ سرکاری ملازم رشوت لینے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہمیں جو تنخواہ ملتی ہے اس میں گزارا نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے ایک دفعہ مجھے بڑا حیرت ناک تجربہ ہوا تھا۔ واپڈا ہاؤس کے آڈیٹوریم میں سیرت کا ایک جلسہ تھا اور میں نے اس میں تقریر کرنی تھی۔ مجھے لینے کے لیے ایک گاڑی آئی جس کا ڈرائیور دیکھنے میں بہت چست تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ سمجھ دار بھی ہے اور چالاک بھی۔ راستے میں' میں پوچھ بیٹھا کہ سرکاری پٹرول تو نہیں بیچتے؟ اس نے دھڑلے سے کہا: بیچتے ہیں۔ میں نے پوچھا: بتا کر بیچتے ہو؟ اس نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ میں ان سے بھی کہتا ہوں کہ جو تنخواہ تم مجھے دیتے ہو اس میں مجھے دو کمروں کا مکان کرائے پر لے دو تو میں یہ پٹرول بیچنا چھوڑ دوں گا— یہ معاملہ ہے

ہمارے ہاں! اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں ہمارے نظام کا بھی قصور ہے جس کو بدلنے کا نام اقامت دین کی جدوجہد ہے اور وہ ہم نے کرنی نہیں ہے۔ اس کے بجائے اس نظام کے اندر رہتے ہوئے بے ایمانیاں‘ سودخوری‘ جھوٹ‘ ملاوٹ‘ دھوکہ دہی اور رشوت وغیرہ‘ یہ سب کرتے رہنا ہے۔ اصل بات وہی ہے کہ جب دین کے تصور میں محدودیت پیدا ہو جائے اور روح کے بجائے صرف ظاہری شکل پیش نظر رہ جائے تو پھر معاشرہ بدعات اور محدثات کا گھنا جنگل بن جاتا ہے۔ اس طرح سنت اور نیکی کے کام ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ برائیاں جنم لے لیتی ہیں۔

آج کے موضوع کو سمیٹتے ہوئے ایک بہت پیاری حدیث ملاحظہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ أُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى)) ’’میری اُمت پوری کی پوری جنت میں جائے گی سوائے اس شخص کے جو خود ہی انکار کر دے‘‘ —— کسی بھی بات کو سمجھانے کے مختلف انداز ہو سکتے ہیں لیکن یہ آپ ﷺ کا متوجہ کرنے کے حوالے سے بہت پیارا انداز ہے کہ میری تمام اُمت جنت میں جائے گی سوائے اس شخص سے جو خود ہی جنت میں جانے سے انکار کر دے۔ یہ سنتے ہی سب صحابہ پوری طرح متوجہ ہو گئے اور حیران ہوتے ہوئے پوچھا یا رسول اللہ! ایسا کون بدبخت ہو گا جو جنت میں جانے سے خود ہی انکار کرے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى))(۱) ’’جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی گویا اس نے (جنت میں جانے سے خود ہی) انکار کر دیا۔‘‘

اللہ ربّ العزت سے دعا ہے کہ ہمیں اس حدیث کے مثبت پہلو پر عمل کرنے‘ مُردہ سنتوں کو زندہ کرنے اور بدعات کی پیروی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد‘ ادارتی معاون)

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة‘ باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ۔

بقیہ : عرضِ احوال

والی ایک غلطی کے باعث آج ہم یہاں تک آ پہنچے ہیں کہ ان مسائل سے چھٹکارا بظاہر ممکن نہیں۔ جب تک ہم اس بنیادی غلطی کی تشخیص کر کے اس کا تدارک نہیں کریں گے گاؤ رفت‘ خرآمد کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا اور حکومت یونہی مفاد پرستوں کے ہاتھوں میں گردش کرتی رہے گی۔ پاکستانی عوام کی مشکلات میں نہ صرف اضافہ ہو گا بلکہ ملک روز بروز کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ عالمی سطح پر جو گیم چل رہی ہے اس کے مطابق امریکہ‘ اسرائیل اور بھارت کا اتحادِ ثلاثہ پاکستان کے وجود کو دنیا کے نقشہ سے غائب کر دینا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت پاکستان جن حالات سے دوچار ہے‘ روایتی انداز میں کسی تبدیلی سے ممکن نہیں کہ پاکستان اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ پاکستان کے استحکام کی واحد اساس اسلام ہے۔ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کے بغیر نہ صرف ہمارا استحکام ممکن نہیں بلکہ ہماری بقا بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ بحیثیتِ مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کی مدد کے بغیر ہم اس اندھے کنویں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہمسایہ ملک افغانستان کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اس پر ۴۳ ملکوں کی سیاسی اور عسکری مدد سے امریکہ نے حملہ کیا۔ ان کے پاس انیسویں صدی کے فرسودہ ہتھیار تھے مگر ان کا اللہ پر مکمل بھروسہ تھا۔ آج پوری دنیا وہاں اپنی شکست کو تسلیم کر چکی ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کی تائید اور نصرت سے ممکن ہوا۔ ہماری رائے میں اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی قائم کیے بغیر ہم کرپشن‘ ٹارگٹ کلنگ‘ مہنگائی اور نااہل حکمرانوں کے عذاب سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ اس کے لیے انقلابی کارروائی کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے یہ انقلاب برپا کرنے کے لیے پاکستان کے عوام ہی کو فیصلہ اور شعوری کوشش کرنا ہو گی۔ یہ معمولی اور سرسری نوعیت کی کوشش سے ممکن نہیں ہو گا‘ کیونکہ آج دنیا میں سیکولرازم کا مکمل تسلط ہے اور اسلامی نظام کی بات کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ایسے ماحول میں اور ایسی فضا میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کرنا شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے‘ لیکن تاریخ گواہ ہے اور سچی بات یہ ہے کہ صرف اسلامی تاریخ میں نہیں انسانی تاریخ کے مطالعہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کسی جمے ہوئے نظام کو تہہ و بالا کرنا اور نیا نظام قائم کرنا اگرچہ انتہائی مشکل بلکہ جان لیوا کام ہے لیکن یہ اعزاز بھی اللہ نے انسان ہی کو بخشا ہے کہ جب وہ کسی مقصد کے لیے پُرعزم ہو جاتا ہے اور پورے خلوص کے ساتھ اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں اُس میں کھپا دیتا ہے تو ایسے ایسے محیّر العقل کام کر گزرتا ہے جو ظاہراً ناممکن نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ نفاذِ اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کے آئیڈیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ہوں گے۔ اُنھوں نے کس طرح اپنا تن من دھن اُس مشن پر نچھاور کر دیا جو اللہ کے رسول ﷺ لے کر آئے تھے۔ مکی زندگی میں اُنھوں نے کیسی کیسی صعوبتیں برداشت کیں‘ جن کا تصور ہی لرزا دینے والا ہے اور مدنی زندگی کا پہلا غزوہ ہی لے لیں‘ کس طرح ۳۱۳ تقریباً نہتے مسلمانوں نے کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کفار کا مقابلہ کیا اور اُنھیں شکست فاش دی۔ یقیناً اللہ نے اُن کی مدد کے لیے فرشتے بھیجے‘ لیکن غارِ حرا سے میدانِ بدر پہنچنے تک آپ ﷺ اور آپ کے ساتھی کن کن مصائب سے گزرے‘ یہ جدوجہد کی ایک طویل اور ہوش ربا داستان ہے۔ آج پاکستان میں بھی اسلامی نظام کا قیام اس سے کمتر ہی سہی لیکن بھرپور قربانیاں مانگتا ہے‘ لہٰذا اللہ کی مدد کے حصول اور فرشتوں کے نزول کے لیے فضائے بدر پیدا کرنا ناگزیر ہے‘ لازم ہے۔ ❁❁

صبر: اپنی معنویت کے اعتبار سے

عتیق الرحمٰن صدیقی

ہم اپنی روزمرہ زندگی میں بعض الفاظ بالعموم استعمال کرتے ہیں اور ہمارے ذہن میں ان کا ایک مفہوم بھی متعین ہوتا ہے‘ ان میں ایک لفظ ’’صبر‘‘ ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں۔ اس سے مراد ارادے کی مضبوطی‘ عزم کی پختگی اور خواہشاتِ نفس کا ایسا انضباط ہے کہ جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب وضمیر کے پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا جائے۔ دراصل اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا اس کی معنوی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ بے بسی اور بے کسی کی تصویر بن جانا اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے باعث سکوت اور خاموشی اختیار کر لینا صبر نہیں‘ بلکہ پامردی‘ اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم سے کام لینا صبر ہے۔ صاحب مفردات القرآن رقم طراز ہیں:

’’الصَّبر کے معنی ہیں کسی کو تنگی کی حالت میں روک رکھنا‘ چنانچہ صَبَرْتُ الدَّابَّة کے معنی ہوں گے ’’میں نے جانور کو چارہ کھلائے بغیر باندھ رکھا‘‘۔ صَبَرْتُ فُلَانًا ’’میں نے اُسے زبردستی قسم کھلائی‘‘۔ لہٰذا الصَّبْر کے معنی ہوئے عقل وشریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضے کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا۔ پس صبر ایک عام لفظ ہے جو مختلف مواقع پر استعمال کے اعتبار سے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی مصیبت پر نفس کو روک رکھنا صبر کہلاتا ہے۔ یہ جزع کی ضد ہے اور جنگ میں نفس کو روک رکھنے کو شجاعت کہا جاتا ہے‘ اس کی ضد جبن (بزدلی) ہے۔ یہی صبر اکثر کسی پریشان کن حادثہ کو برداشت کرنے کی صورت میں ہو تو اسے رَحْبُ الصدر (کشادہ دلی) کہتے ہیں‘ جس کی ضد ضجر ہے۔ اگر کسی بات کو روک رکھے تو اسے کتمان کہتے ہیں‘ اس کی ضد مَذل (مجبور ہو کر راز فاش کر دینا) ہے۔ قرآن نے ان تمام صفات کو صبر کے لفظ سے یاد کیا ہے۔‘‘

قرآن حکیم میں جابجا مختلف سیاق وسباق میں صبر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جناب خضر کے قصہ کو سورۃ الکہف میں ملاحظہ کیجیے تو صبر اور اس کے مشتقات کو متعدد آیات میں استعمال ہوتا پائیں گے:

﴿قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۝ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ۝﴾

’’اس نے جواب دیا: آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو آخر آپ اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ (موسیٰؑ نے) کہا: ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔‘‘

دونوں سفر پر روانہ ہوئے‘ حضرت خضر جو اقدام بھی کرتے حضرت موسیٰؑ متحیّر ہو کر بول اٹھتے‘ تو حضرت خضر نے ان سے کہا: ﴿اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝﴾ (الکھف) ’’میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے‘‘۔ گویا غیر معمولی حالات پیش آنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں جو بے چینی اور اضطراب پیدا ہوتا تھا اس کی بدولت وہ معترض ہوتے تھے۔

کفار انبیاء علیہم السلام کے بار بار سمجھانے کے باوجود اپنے باطل موقف پر قائم رہتے اور آپس میں کہتے: ﴿اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ﴾ (صٓ:۶) ’’کہ چلو اور اپنے خداؤں پر صبر کرو (یعنی مضبوطی کے ساتھ قائم رہو)‘‘۔ عرب کے بدو اور گنوار ناشائستہ مزاج کے باعث حضور ﷺ کے حجرہ کے سامنے آ کر آوازیں دیتے کہ اے محمدؐ باہر آؤ! اللہ نے اس طرزِ عمل کو ناپسند کیا‘ نبی کریم ﷺ کو بھی ان کے اس گنوار پن پر تکلیف ہوتی تھی۔ اس پر فرمایا گیا کہ اتنی گھبراہٹ کی ضرورت کیا تھی‘ بہتر تھا کہ صبر کر لیا جاتا: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ (الحجرات:۵) ’’اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے) یہاں تک کہ آپ (اے رسول ﷺ!) نکل کر ان کے پاس آتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔‘‘

حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو تصورِ توحید پر مشرکینِ مکہ کی جبینیں شکن آلود ہو گئیں‘ غیظ وغضب کی مختلف صورتیں آشکارا ہونے لگیں‘ مخالفتوں‘ مخاصمتوں اور رکاوٹوں کا ایک طوفان تھا جو تھمنے میں نہیں آ رہا تھا‘ عداوتوں کا سیلابِ بلاخیز آپؐ کی راہیں روکنے کے لیے موجود تھا۔ بشریت کے اقتضا کی بدولت آپؐ مضطرب ہوتے۔ قرآن نے آپؐ کو تسکین وطمانیت کا پیغام دیا کہ آپ مستعدی سے راہِ مستقیم پر گامزن رہیں‘ مخالفین کے شور

وغوغا' طنز وتعریض اور دشنام واتہام کی پروانہ کریں اور صبر وضبط سے کام لیں۔ فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ (الطور:٤٨) ''(اے رسول ﷺ!) آپ اپنے پروردگار کے فیصلہ کے ثابت قدم رہ کر منتظر رہیے' کیونکہ آپ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں''۔ پھر فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۭ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝١٠٩﴾ (یونس) ''اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہیے یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے' اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے''۔ رسول اللہ ﷺ کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا کہ نافرمان قوم پر عذاب میں تاخیر سے وہ پریشان ہوئے اور وحی کا انتظار کیے بغیر اپنی بستی سے نکل کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ (ن:٤٨) ''اپنے پروردگار کے فیصلے کا ثابت قدمی کے ساتھ انتظار کیجئے اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو جایئے''۔ یعنی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ گویا مناسب وقت کا انتظار کرنا ضروری ہے۔

صبر کا ایک مطلب یہ ہے کہ مصائب وشدائد میں بے قراری نہ ہو بلکہ اللہ کی مصلحت جان کر اسے جھیلا جائے اور اُس کی نصرت وحمایت کا یقین رکھا جائے۔ ایسے صبر کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب بیٹوں نے یہ خبر بد سنائی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے نے کھا لیا ہے تو آپؑ نے فرمایا: ﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ ۝١٨﴾ (یوسف) ''بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑ لی ہے' پس صبر ہی بہتر ہے' اور اللہ ہی سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو''۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس پامردی سے برداشت کیا اور اُس کی رضا پر راضی رہے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝٤٤﴾ (صٓ) ''ہم نے بے شک ایوبؑ کو صابر پایا۔ وہ اللہ کی طرف رجوع ہونے والا تھا۔''

صبر کا ایک مفہوم یہ ہے کہ راہِ حق میں پیش آنے والی مشکلات اور مخالفین کی طرف سے تضحیک اور استہزاء کو خاطر میں نہ لایا جائے بلکہ استقلال ومضبوطی کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا کام جاری رکھا جائے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝٢ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝٤ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝٥ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝٦ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝٧﴾ (المدثر) ''اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اٹھو اور خبردار کرو' اور اپنے ربّ کی بڑائی کا اعلان کرو' اور اپنے کپڑے

پاک رکھو' اور گندگی سے دور رہو' اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے' اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو''—— حضور نبی کریم ﷺ کو پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کو پیش آنے والے واقعات کی طرف متوجہ کیا گیا اور ان کی پیروی کا حکم دیا گیا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ﴾ (الاحقاف:٣٥) ''(اے محمد ﷺ!) آپ بھی اسی طرح ثابت قدم رہیں جس طرح پختہ ارادہ کرنے والے پیغمبر ثابت قدم رہے اور ان (مخالفوں) کے لیے جلدی نہ کریں''—— حضرت لقمانؒ کی زبان سے بیٹے کو کی گئی نصیحت قرآن حکیم میں نقل کی گئی: ﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝١٧﴾ (لقمٰن) ''اے میرے بیٹے! نماز کی پابندی کرنا' نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے منع کرتے رہنا' اور جو مصیبت تجھ پر واقع ہو اس پر صبر کرنا۔ بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں''—— مشرکین مکہ دل دوز طعن وتشنیع سے نبی کریم ﷺ کو ذہنی ایذا پہنچاتے تھے اور انہیں دق کرنے کی کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ فرمایا گیا کہ ان کی بے ہودگیوں کی پروانہ کریں اور اپنی دھن میں لگے رہیں۔ پہلے انبیاء ورسل کے ساتھ بھی ان کی اُمتوں نے یہی سلوک روا رکھا: ﴿اِصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ﴾ (ص:١٧) ''صبر کرو اس پر جو یہ بکواس کرتے ہیں اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو''۔ متعدد مواقع پر حضور نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جاتی رہی تاکہ خطرات اور مشکلات میں آپؐ کے قدموں میں لغزش پیدا نہ ہو' اشتعال انگیز مواقع پر نہ تو غیظ وغضب کے ہیجان میں مبتلا ہوں اور نہ یاس ونومیدی کا شکار ہوں' عزیمت واستقامت کا پیکر بن کر شرک وکفر کا مقابلہ کرتے رہیں' انبیاء کے نقوشِ قدم اور اسوہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

بداندیش اور بدخواہ اور برائی کرنے والے کے قصور کو معاف کر دینا' تحمل اور بردباری سے کام لینا بھی صبر کے مفہوم میں داخل ہے۔ اخلاقی اعتبار سے یہ اعلیٰ وصف ہے اور وسعتِ قلبی پر دال ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝١٢٦ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝١٢٧﴾ (النحل)

''اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تکلیف تم کو دی گئی' اور البتہ اگر صبر کرو تو صبر کرنے

والوں کے لیے یہ بہتر ہے۔ اور آپؐ صبر کیجئے اور آپؐ کا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد کے ساتھ' اور آپؐ ان کا غم نہ کریں اور نہ ان کی سازشوں سے آپؐ کا دل تنگ ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے نیکوکاروں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۱۷۷﴾ (البقرۃ)

''اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں' اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔''

گویا وہ باطل کا سر کچلنے کے لیے میدانِ عمل میں رزم آرا ہوتے ہیں' تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جامِ شہادت نوش کرتے ہیں —— باطل کو چیلنج کر کے میدانِ جنگ میں کود پڑنا صبر کے مفہوم میں داخل ہے۔ قرآن نے کہا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۴۵ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۴۶﴾ (الانفال)

''اے ایمان لانے والو! جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو' توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی' اور صبر سے کام لو' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

کتاب اللہ میں استقامت اور ثابت قدمی کو' بالخصوص جنگ کی صورت میں بہادرانہ طرزِ عمل کو صبر سے تعبیر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قلت تعداد کی تلافی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ایک قلیل تعداد نے کثیر تعداد پر غلبہ حاصل کیا۔ اسلامی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے۔ اسی لیے اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ میدانِ کارزار میں تعداد کی قلت کو خاطر میں نہ لائیں اور صبر و ثبات کے ساتھ دو چند کا مقابلہ کریں' اللہ کی مدد اور تائید انہیں حاصل ہوگی۔

طالوت اور جالوت کے قصہ میں قلت تعداد کے نکتہ کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ

وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۲۴۹ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۵۰ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ﴾

''پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے' انہوں نے کہا: بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے' اور اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔ اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلے تو انہوں نے دعا کی: اے ہمارے رب' ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمارے قدم جما دے' اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔ آخر کار اللہ کے اذن سے انہوں نے کافروں کو مار بھگایا۔''

طالوت کے لشکروں نے جو کامل ایمان سے منزہ اور مرصع تھے' بڑے گروہ سے گھبرانے کے بجائے اللہ کی نصرت پر بھروسا کیا' بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو کر صبر کا فیضان طلب کیا اور دعا کی کہ وہ انہیں ثابت قدمی سے نوازے۔ چنانچہ اس روحانی قوت کی بدولت وہ سرخرو اور فائز المرام ہوئے۔

عیش و طرب کے عالم میں یادِ الٰہی موجود رہے اور طیش کے عالم میں اللہ کا خوف برقرار رہے تو یہ انضباط بڑا قوی الاثر ہوتا ہے۔ رنج و راحت میں ضبطِ نفس کا برقرار رہنا اور آپے سے باہر نہ ہونا' قوموں اور اشخاص کی فلاح و کامرانی کا ضامن ہے۔ قرآن حکیم نے اس بات کو یوں بیان فرمایا:

﴿وَلَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَاۗءَ بَعْدَ ضَرَّاۗءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱﴾ (ھود)

''اور اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہو کر ناشکری کرنے لگتا ہے۔ اور اگر اس مصیبت کے بعد جو اس پر آئی تھی

ہم اسے نعمت کا مزا چکھاتے ہیں تو کہتا ہے میرے تو سارے دلدر پار ہو گئے' پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔ اس عیب سے پاک صرف صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی۔''

حالات کی نامساعدت کے باوجود اور روز و شب پیش آنے والی مشکلات سے دوچار رہتے ہوئے بھی وہ فرائض جو نفس پر گراں گزرتے ہیں' انہیں ادا کرتے رہنا صبر کے ذیل میں آتا ہے۔ ہر کام میں مشکلات کے باوجود اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری اجر عظیم کا باعث ہے۔ اللہ ربّ العزت نے فرمایا:﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ﴾ (مریم:٦٥) ''(اللہ ہی ہے) آسمانوں کا پروردگار اور زمین کا اور جو ان دونوں کے بیچ میں ہے' تو آپ اس کی بندگی کریں اور اس کی بندگی پر ٹھہرے رہیں (صبر کریں)''۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے تخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کا تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے' اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو''۔ گویا اللہ سے ڈرنے اور تقویٰ اختیار کرنے کا عمل عارضی نوعیت کا نہیں' مرتے دم تک اللہ کی فرمانبرداری اور وفاداری پر قائم رہنا مقصود ہے۔ نیک کاموں کو بارِ خاطر اور خلافِ طبع ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہنا صبر کا اعلیٰ درجہ ہے۔ ایسے صابروں کی اس کی بارگاہ میں جزا بھی بڑی بھاری ہے۔

عارضی و ہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتے رہنا صبر اور برداشت ہی سے ممکن ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں قارون کی دولت سے ظاہر پرست مرعوب ہو گئے تھے' مگر چشم بینا رکھنے والے جانتے تھے کہ دولت کی یہ چمک دمک عارضی ہے اور جو دولت نیکوکاروں کے حصے میں آنے والی ہے وہ لازوال اور جاودانی ہوگی۔ فرمایا گیا:

﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (النحل)

''جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔ اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔''

قرآن مجید نے خوشخبری دی کہ:﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

(الزمر) ''صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی''۔ جن محاسن کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے ان میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے۔ صبر کا درجہ بڑی نیکیوں کے برابر ہے۔ صبر اور دعا کو مشکلات کی فتح کی کلید قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرۃ) ''اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت پکڑو۔ بے شک اللہ صبر والوں (ثابت قدم رہنے والوں) کے ساتھ ہے۔''

سورۃ العصر میں حق کی وصیت کے ساتھ صبر کی وصیت کرنے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ سورۃ البلد میں فرمایا:

﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾

''پھر آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلق خدا پر) رحم کی تلقین کی۔''

سید مودودیؒ نے اس آیۂ کریمہ کے ضمن میں صبر کے وسیع مفہوم کی گراں قدر تشریح کی ہے' وہ لکھتے ہیں:

''قرآن مجید جس وسیع مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے اس کے لحاظ سے مؤمن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے' خدا کے احکام کی اطاعت اور پیروی میں صبر کی ضرورت ہے' خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے' اخلاق کی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے' قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر سے ہی ہو سکتا ہے۔ بے شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات' تکالیف' مصائب اور محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں' صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مؤمن بخیریت نہیں گزر سکتا۔ پھر ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل و عیال' اپنے خاندان' اپنے معاشرے' اپنے ملک و قوم اور دنیا بھر کے شیاطین جن و انس کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے' حتیٰ کہ راہِ خدا میں ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ ان سب حالات میں صبر ہی

کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے۔'' (تفہیم القرآن' جلد ششم' حاشیہ ۱۴)

صبر کا لفظ اپنی معنویت کے اعتبار سے نہایت جامع اور وسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ ایمان کی پوری دُنیوی زندگی ہی کو صبر قرار دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں صبر کی فضیلت بھی بہت زیادہ ہے۔ قرآن مجید میں ستر سے زیادہ مقامات پر صبر کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۭ﴾ (الاعراف:۱۳۷) ''اور بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا' کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا'' — سورۃ النحل میں صابرین کا اجر بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۶﴾ ''اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے'' — سورۃ القصص میں فرمایا: ﴿اُولٰۗىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (آیت ۵۴) ''یہ وہ لوگ ہیں جن کا اجر دوبار دیا جائے گا اس صبر کے بدلے جو انہوں نے دکھایا۔''

ہر نیکی کا اجر ایک اندازے سے ملتا ہے' مگر صبر کرنے والوں کو دوہرے اجر سے نوازا جاتا ہے اور انہیں اللہ کی معیت نصیب ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں صبر کو بہتر اور وسیع تر عطیہ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ انصار کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا' آپؐ نے انہیں عطا فرمایا' پھر سوال کیا آپؐ نے پھر عطا فرمایا۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پاس جو کچھ تھا وہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

> ''میرے پاس جو مال آتا ہے وہ میں تم سے بچا کر نہیں رکھتا۔ جو شخص اللہ سے عفت چاہتا ہے اللہ اس کو عفیف بنا دیتا ہے اور جو استغنا طلب کرتا ہے اس کو مستغنی بنا دیتا ہے اور جو کوشش کر کے صبر اختیار کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے' اور کسی کو صبر سے بہتر اور وسیع تر عطیہ نہیں دیا گیا۔'' (ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم)

صاحب ''اسلامی تصوف'' سید احمد عروج قادری نے احیاء علوم الدین' جلد چہارم کے حوالہ سے ایک اثر نقل کیا ہے کہ:

> ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا کہ تم صبر کو اپنے اوپر لازم کر لو اور جان لو کہ صبر دو طرح کے ہوتے ہیں' ان میں سے ایک دوسرے سے افضل ہے۔ مصیبتوں پر صبر بہتر ہے لیکن اس سے افضل صبر وہ ہے جو ممنوعات اور محرمات سے کیا جاتا ہے۔ جان لو کہ صبر وہ چیز ہے جس پر ایمان کا قیام ہے اور یہ اس لیے کہ تقویٰ

سب سے افضل نیکی ہے اور تقویٰ صبر ہی سے حاصل ہوتا ہے۔''

آخر میں تمام اہل اسلام سے گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بے نیازی کے تصور کو تازہ اور زندہ کیا جائے' اُس کے جود و کرم اور اُس کے قہر و غضب پر نگاہ رکھی جائے' قرآن و حدیث کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے' سیرت رسولؐ اور اُسوۂ صحابہ کو تسلسل کے ساتھ پیش نظر رکھا جائے' صبر و صلوٰۃ سے بارگاہ ایزدی میں دعا کی جاتی رہے' تسبیح و تحمید کو مستحضر رکھا جائے' دین حق کی سربلندی کے لیے قول' عمل اور قلم سے سرگرم عمل رہا جائے' گرد و پیش میں ہونے والے واقعات پر تدبّر و تفکّر کیا جائے' فضائل اخلاق سے متمتع ہونے اور رذائل اخلاق سے اجتناب کی تدابیر اختیار کی جائیں اور ''صحبت صالح ترا صالح کند'' کا طرزِ عمل اپنایا جائے — ان کے علاوہ موت کو یاد کرنے سے قوتِ صبر کو ارتقاء نصیب ہوتا ہے۔ صبر کی تلقین سے حق کی پیروی اور حمایت میں جو دشواریاں اور مشکلات پیش آتی ہیں انہیں عزیمت اور ثابت قدمی سے برداشت کرنے کی قوت نمو پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ العصر میں حق کی نصیحت کے ساتھ اہل ایمان کو خسارے اور نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے صبر کی تلقین کو شرطِ لازم قرار دیا گیا ہے۔ ❁❁

بقیہ: رحمت کیا ہے؟

میں محبت و اخوت کے جذبات موجزن ہیں۔ رحمت سے عافیت و سلامتی اور حفاظت نصیب ہو رہی ہے۔ رحمت سے عطائیں مل رہی ہیں۔ رحمت سے کرم فرمائیاں ہو رہی ہیں۔ رحمت سے فضل نصیب ہو رہا ہے۔ رحمت سے تقویٰ و ولایت نصیب ہو رہی ہے۔ رحمت سے قدس و پاکیزگی نصیب ہو رہی ہے۔ رحمت سے قبر کی منزلیں آسان ہو رہی ہیں۔ رحمت سے معرفت الٰہی اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نصیب ہو رہی ہے۔ رحمت سے علم لدنی نصیب ہوتا ہے۔

یاد رکھیں' جب جمیع کائنات خوش بختی کی انتہاؤں کو چھو لے تو اسے بے پناہ و بے کنار رحمت کے لیے رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نصیب ہو جاتے ہیں' اور جسے آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ رحمت نصیب ہو جائے تو اس کا بدترین گناہ بھی اس کے لیے نہ صرف رشد و ہدایت کا باعث بن جاتا ہے بلکہ اسے عظیم مراتب پر فائز فرما دیتا ہے۔ اس کا ثبوت وہ عورت ہے جو اپنے مشرکانہ جذبات کے بدترین اظہار کے لیے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ذات بے ہمتا پر گھر کا کوڑا پھینک کر عظیم ترین گناہ کی مرتکب ہوتی تھی' لیکن بیمار ہونے پر جب اسے لذتِ رحمت چکھنے کی سعادت نصیب ہوئی تو لمحوں میں عمر بھر کا رجس پاکیزگی میں ڈھل گیا اور صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ناقابل موازنہ مقام پر فائز ہو گئیں۔ یہ ہوتی ہے رحمت — اور اس طرح کے ہوتے ہیں صاحبانِ رحمت! ❁❁❁

بلادِ شام اور دَورِ فتن

احادیث نبویہ کی روشنی میں

تحریر: حافظ محمد زبیر

بلادِ شام (The Levant) جسے احادیثِ نبویہ میں 'شام' کہا گیا ہے' دین اسلام کی تعلیمات کے مطابق ایک بابرکت اور مقدس سرزمین ہے۔ احادیث مبارکہ میں جس خطہ ارضی کو 'شام' کہا گیا ہے' اس کی جغرافیائی حدود اس مملکت سے بہت وسیع ہیں جسے معاصر دنیا 'شام' (Syria) کے نام جانتی ہے۔ معاصر شام (Syria) ۱۹۴۶ء میں فرانس کے قبضے سے آزاد ہونے کے بعد دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔ اس سے پہلے شام (The Levant) کے نام سے موجود خطہ ارضی میں فلسطین' اسرائیل' موجودہ شام' اردن' لبنان' سائپرس اور ترکی کا ایک صوبہ شامل تھا۔ (http://en.wikipedia.org/wiki/Levant)

اہلِ علم اور جغرافیہ دان حضرات کی ایک جماعت ابواسحاق اصطخری (متوفی ۳۴۶ھ)' یاقوت الحموی (متوفی ۶۲۶ھ)' ابن شداد (متوفی ۶۸۴ھ)' زکریا القزوینی (متوفی ۶۸۲ھ)' شمس الدین اسیوطی (متوفی ۸۸۰ھ) اور ڈاکٹر شوقی ابوخلیل نے شام کی حدود کم وبیش ایک ہی جیسی بیان کی ہیں اور وہ طولاً (یعنی شمالاً جنوباً) فرات سے عریش مصر اور عرضاً (یعنی شرقاً غرباً) جبل طے سے بحیرۂ روم تک ہیں۔ حالیہ جغرافیائی تقسیم کے تناظر میں شام سے مراد فلسطین' موجودہ شام' اردن اور لبنان کا علاقہ بنتا ہے۔ (۱)

اگرچہ احادیث میں 'شام' سے مراد بلادِ شام ہے کہ جس میں موجودہ شام کے علاوہ فلسطین' اردن اور لبنان بھی شامل ہے لیکن اس پورے خطہ میں فلسطین میں 'بیت المقدس' اور موجودہ شام میں 'دمشق' کی اہمیت وفضیلت نصوص میں بطور خاص منقول ہے۔

بلادِ شام کے فضائل و برکات

قرآن مجید میں کئی ایک ایسے مقامات ہیں جو بلادِ شام کی فضیلت پر دلالت کرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء)

''اور ہم نے ابراہیم اور لوط (علیہما السلام) کو اسی سرزمین میں پناہ دی کہ جسے ہم نے اہلِ دنیا کے لیے بابرکت بنایا ہے۔''

امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ اس آیت سے مراد سرزمین شام ہے' کیونکہ اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت ابراہیم اور لوط علیہما السلام کی ہجرت عراق سے شام کی طرف تھی۔ (۲)

اسی طرح بلادِ شام کے بارے میں احادیثِ نبویہ میں بھی کئی ایک فضائل و برکات منقول ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ شَامِنَا وَفِيْ يَمَنِنَا)) قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَفِيْ نَجْدِنَا؟ قَالَ: ((اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ شَامِنَا وَفِيْ يَمَنِنَا)) قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَفِيْ نَجْدِنَا؟ فَاَظُنُّهٗ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: ((هُنَاكَ الزَّلَازِلُ وَالْفِتَنُ وَبِهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ)) (۳)

''اے اللہ تعالیٰ! ہمارے لیے ہمارے شام اور ہمارے یمن میں برکت فرما''۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اور ہمارے نجد میں بھی؟ (یعنی نجد میں بھی برکت کی دعا فرمائیں)۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ دعا فرمائی: ''اے اللہ! ہمارے شام اور یمن کو ہمارے لیے بابرکت بنا''۔ راوی کہتے ہیں کہ غالباً تیسری مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے (نجد میں برکت کی دعا کی درخواست پر) فرمایا: ''وہاں زلزلے اور فتنے برپا ہوں گے اور وہیں سے شیطان کا سینگ برآمد ہوگا۔''

اس روایت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بلادِ شام کے لیے برکت کی دعا فرمائی ہے جو اس خطہ ارضی کی فضیلت کی دلیل ہے۔ اس حدیث میں نجد سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ معروف جغرافیہ دان یاقوت الحموی (۵۷۴-۶۲۶ھ) نے اپنی کتاب 'معجم البلدان' میں اہلِ عرب کے نزدیک کئی ایک نجد کے علاقوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں نجدِ یمامہ' نجدِ یمن' نجدِ حجاز' نجدِ عراق' نجدِ خال' نجدِ عقاب اور نجدِ اجاء وغیرہ اہم ہیں۔

ابن عبدالبر (۳۶۸-۴۶۳ھ) وغیرہ کا اپنی کتاب 'التمہید' میں یہ قول منقول ہے کہ اس حدیث میں نجد سے مراد نجدِ عراق ہے۔ امام خطابی (۳۱۹-۳۸۸ھ) اور امام ابن حجر (۷۷۳-۸۵۲ھ) کا بھی یہی قول ہے۔ علامہ البانی (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) کا کہنا ہے کہ اس

روایت کے متعدد طرق 'عراق' ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کیونکہ بعض روایات میں 'نجد' کی بجائے 'مشرق' کے الفاظ ہیں (صحیح بخاری' کتاب المناقب) اور مدینہ کا مشرق عراق ہے۔ امام بخاری نے بھی اس حدیث پر 'الفتنة من قبل المشرق' کا باب باندھ کر یہ واضح کیا ہے کہ نجد سے مراد مدینہ کے مشرق کی سمت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نجدِ حجاز ہے' لیکن اس قول کی صورت میں شیطان کے سینگ کے طلوع ہونے سے شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۷۰۳۔۱۷۹۱ء) کی طرف اس کی نسبت کرنا درست نہیں ہے' جیسا کہ علامہ البانی نے 'السلسلة الصحيحة' میں لکھا ہے کہ اشخاص کا مقام و رتبہ ان کے افکار و اعمال کے تناظر میں طے ہوتا ہے نہ کہ جگہ کے تقدس و تشاؤم کے پہلو سے' ورنہ تو مقدس سرزمین فلسطین پر اسرائیل کی ریاست قائم ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((طُوْبٰى لِلشَّامِ)) فَقُلْنَا: لِأَيِّ ذٰلِكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((لِأَنَّ مَلَائِكَةَ الرَّحْمٰنِ بَاسِطَةٌ اَجْنِحَتَهَا عَلَيْهَا)) (۴)

''شام کے لیے خوشخبری ہو''۔ ہم نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کس وجہ سے خوشخبری؟ تو آپ نے فرمایا: ''رحمان کے فرشتوں نے اپنے پر شام پر پھیلائے ہوئے ہیں۔''

یہ روایت بھی شام کی سرزمین کے بابرکت ہونے کی واضح دلیل ہے۔ علامہ البانی نے اس روایت کو 'صحیح' قرار دیا ہے۔ (۵)

دورِ فتن میں شام میں قیام کی تاکید

احادیث نبویہ میں کئی ایک روایات ایسی ملتی ہیں کہ جن میں دورِ فتن میں سرزمین بلادِ شام میں قیام کی تاکید کی گئی ہے۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((بَيْنَا اَنَا نَائِمٌ إِذَا رَأَيْتُ عُمُوْدَ الْكِتَابِ احْتَمِلَ مِنْ تَحْتِ رَأْسِيْ فَظَنَنْتُ أَنَّهُ مَذْهُوْبٌ بِهِ فَاَتْبَعْتُهُ بَصَرِيْ فَعُمِدَ بِهِ إِلَى الشَّامِ أَلَا وَإِنَّ الْإِيْمَانَ حِيْنَ تَقَعُ الْفِتَنُ بِالشَّامِ)) (۶)

''اس دوران کہ میں سویا ہوا تھا میں نے دیکھا کہ کتاب کا عمود میرے سر کے نیچے سے کھینچ لیا گیا' پس مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اب یہ جانے والا ہے تو میری نگاہ نے اس کا پیچھا کیا اور وہ شام تک پہنچ گئی۔ خبردار! فتنوں کے وقت ایمان شام کی سرزمین میں ہوگا۔''

کتاب کے عمود سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ اہلِ تعبیر یہ کہتے ہیں کہ خواب میں عمود سے مراد 'دین' یا وہ شخص ہوتا ہے کہ جس پر دین کا انحصار ہو۔ اس لیے خواب میں عمود کی دو معروف تعبیرات میں سے ایک 'دین' اور دوسرا 'سلطان' کی گئی ہے۔ (۷) بہرحال دونوں تعبیرات کی روشنی میں شام کی فضیلت و اہمیت مسلم ہے' جیسا کہ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں۔ حضرت معاویہ بن قرۃ اپنے والد رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِذَا فَسَدَ أَهْلُ الشَّامِ فَلَا خَيْرَ فِيْكُمْ، لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِيْ مَنْصُوْرِيْنَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ)) (۸)

''جب اہل شام بگڑ جائیں گے تو پھر اس اُمت میں کوئی خیر باقی نہیں رہے گا۔ اور میری اُمت میں سے ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے گا کہ جسے قیامت تک خدائی نصرت شامل حال رہے گی۔ جو انہیں ذلیل کرنا چاہے وہ ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔''

پس بلادِ شام میں اصحاب علم و فضل اور اہل حل وعقد کی ایک جماعت قیامت تک ایسی رہے گی کہ جسے خدائی نصرت شامل حال رہے گی۔ امام ابن تیمیہؒ نے ایک لطیف نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ خلق و امر میں مبدأ و معاد مکہ اور شام ہیں' ارادہ کونیہ ہو یا ارادہ شرعیہ۔ دنیا و دین کی ابتدا مکہ سے ہوئی اور دنیا و دین کی انتہا شام میں ہوگی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی ابتدا اور ظہور مکہ سے ہوا اور اس کا کمال و عروج شام میں مہدی کے ظہور سے حاصل ہوگا (۹)۔ جیسا کہ بعض روایات میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے نزول کے بارے میں یہی بشارت منقول ہے کہ دمشق کی مشرقی جانب موجود سفید منارہ پر دو فرشتوں کے پروں پر ہاتھ رکھے ان کا نزول ہوگا (۱۰)۔ حضرت عبداللہ بن حوالہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((سَيَصِيْرُ الْاَمْرُ إِلٰى أَنْ تَكُوْنُوْا جُنُوْدًا مُجَنَّدَةً جُنْدٌ بِالشَّامِ وَجُنْدٌ بِالْيَمَنِ وَجُنْدٌ بِالْعِرَاقِ)) قَالَ ابْنُ حَوَالَةَ خِرْ لِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنْ أَدْرَكْتُ ذٰلِكَ ، فَقَالَ: ((عَلَيْكَ بِالشَّامِ فَإِنَّهَا خِيَرَةُ اللّٰهِ مِنْ أَرْضِهِ يَجْتَبِيْ إِلَيْهَا خِيَرَتَهُ مِنْ عِبَادِهِ، فَإِمَّا إِنْ أَبَيْتُمْ فَعَلَيْكُمْ بِيَمَنِكُمْ ، وَاسْقُوْا مِنْ غُدُرِكُمْ ، فَإِنَّ اللّٰهَ تَوَكَّلَ لِيْ بِالشَّامِ وَأَهْلِهِ)) (۱۱)

''تمہارے دین اسلام کا معاملہ یہ ہوگا کہ تم لشکروں کی صورت میں بٹ جاؤ گے۔ ایک لشکر شام میں' ایک عراق میں اور ایک یمن میں ہوگا''۔ ابن حوالہ نے کہا: اے اللہ کے

رسول ﷺ! اگر میں اس زمانے کو پالوں تو مجھے اس بارے میں کوئی وصیت فرما دیں۔
آپ ﷺ نے فرمایا: شام کو پکڑ لے کیونکہ وہ اللہ کی زمینوں میں سے بہتر سرزمین ہے۔
اللہ کے بہترین بندے اس کی طرف کھنچے چلے جائیں گے۔ پس اگر تمہارا ذہن شامی لشکر
کا ساتھ دینے پر مطمئن نہ ہو تو یمن کی طرف چلے جانا اور صرف اپنے گھاٹ سے پانی
پینا۔ اللہ تعالیٰ نے میرا اکرام کرتے ہوئے شام اور اہل شام کی ذمہ داری لے لی ہے۔''

علامہ البانی نے اس روایت کو 'صحیح' قرار دیا ہے(۱۲)۔ اپنے گھاٹ سے پانے پینے سے مراد یہ ہے کہ اپنے آبی وسائل تک محدود ہو جاؤ' کیونکہ دورِ فتن ہے' لہٰذا دوسروں کے گھاٹ سے استفادہ کی کوشش فتنوں اور لڑائیوں میں مزید اضافہ کا باعث بن سکتی ہے۔ ایک اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں باہمی افتراق وفتن کے ایسے دور میں اللہ کے رسول ﷺ پہلے سے موجود وسائل وذرائع پر قناعت کی تلقین فرما رہے ہیں اور مزید کی حرص وتلاش سے منع فرما رہے ہیں تاکہ یہ عمل امت میں مزید افتراق وانتشار کا باعث نہ بن جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((سَتَكُوْنُ هِجْرَةٌ بَعْدَ هِجْرَةٍ فَخِيَارُ أَهْلِ الْأَرْضِ أَلْزَمُهُمْ مُهَاجَرَ إِبْرَاهِيْمَ وَيَبْقٰى فِي الْأَرْضِ شِرَارُ أَهْلِهَا)) (۱۳)

''ہجرت (مدینہ) کے بعد ایک اور ہجرت ہوگی اور زمین پر موجود بہترین لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کی جگہ کی طرف ہجرت کریں گے اور بقیہ زمین پر صرف شریر لوگ باقی رہ جائیں گے۔''

علامہ البانی نے اس روایت کو 'صحیح' قرار دیا ہے۔(۱۴) یہ دورِ فتن کی ہجرت ہے اور اسے ہجرتِ مدینہ کی ہجرت کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ پس اسلام میں پہلی ہجرت' ہجرت مدینہ تھی جو اہلِ مکہ کے فتن وآزمائشوں کے سبب ہوئی اور مدینہ منورہ اس ہجرت کے سبب عظیم سلطنتِ اسلامیہ کے قیام کی نہ صرف بنیاد بنا بلکہ خلافت اسلامیہ کا مرکز اول بھی قرار پایا۔ اسلام میں آخری ہجرت کفار کی آزمائش کے سبب بلادِ شام کی طرف ہوگی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور مہدی کے ظہور کی سرزمین ہے اور اسی سرزمین میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کرنے کے بعد دوسری بار خلافت اسلامیہ علیٰ منہاج النبوۃ کی بنیاد رکھیں گے۔ پس اسلام کے ابتدائی عروج کا مرکز مدینہ تھا تو انتہائی عروج کا مرکز ارضِ مقدس ہے۔

بعض روایات میں اس طرف اشارہ ہے کہ اہلِ روم کی طرف سے اہلِ شام پر اقتصادی

پابندیاں عائد کی جائیں گی۔ حضرت ابونضرۃ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ہم جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ انہوں نے فرمایا:

يُوْشِكُ أَهْلُ الْعِرَاقِ أَنْ لَا يُجْبٰى إِلَيْهِمْ قَفِيْزٌ وَلَا دِرْهَمٌ، قُلْنَا مِنْ أَيْنَ ذٰلِكَ؟ قَالَ: مِنْ قِبَلِ الْعَجَمِ يَمْنَعُوْنَ ذٰلِكَ، ثُمَّ قَالَ: يُوْشِكُ أَهْلُ الشَّامِ أَنْ لَا يُجْبٰى إِلَيْهِمْ دِيْنَارٌ وَلَا مُدْيٌ، قُلْنَا مِنْ أَيْنَ ذٰلِكَ؟ قَالَ: مِنْ قِبَلِ الرُّوْمِ(۱۵)

''قریب ہے کہ اہل عراق کو ان کا قفیز (ماپ تول کا ایک پیمانہ) اور درہم (چاندی کی کرنسی) کچھ فائدہ نہ دے۔ ہم نے کہا: ایسا کہاں سے ہوگا؟ تو انہوں نے کہا: عجم (غیر عرب) سے ہوگا' وہ اسے روک دیں گے۔ پھر حضرت جابرؓ نے کہا: قریب ہے کہ اہل شام کو ان کا دینار (سونے کی کرنسی) اور مدی (ماپ تول کا ایک پیمانہ) کچھ فائدہ نہ دے۔ تو ہم نے کہا: یہ کیسے ہوگا؟ تو حضرت جابرؓ نے کہا: یہ اہل روم کی طرف سے ہوگا۔''

اس روایت کے مفہوم سے اہل فلسطین بھی مراد لیے جا سکتے ہیں کہ جنہیں اسرائیل کی طرف سے متعدد پابندیوں کا سامنا ہے اور موجودہ شام بھی مراد ہو سکتا ہے کہ جسے حالیہ شورشوں کے سبب کئی اعتبارات سے اقتصادی پابندیوں کا سامنا ہے۔ ایک اور روایت میں دورِ فتن میں سرزمین شام کو مسلمانوں کا وطن قرار دیا گیا ہے۔ حضرت سلمہ بن نفیل کندی سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے کہا:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ أَذَالَ النَّاسُ الْخَيْلَ وَوَضَعُوا السِّلَاحَ وَقَالُوْا لَا جِهَادَ قَدْ وَضَعَتِ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ، فَأَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِوَجْهِهٖ وَقَالَ: ((كَذَبُوا الْآنَ الْآنَ جَاءَ الْقِتَالُ وَلَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ وَيُزِيْغُ اللّٰهُ لَهُمْ قُلُوْبَ أَقْوَامٍ وَيَرْزُقُهُمْ مِنْهُمْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ وَحَتّٰى يَأْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ، وَالْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ فِيْ نَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُوَ يُوْحٰى إِلَيَّ أَنِّيْ مَقْبُوْضٌ غَيْرَ مُلْبَثٍ وَأَنْتُمْ تَتَّبِعُوْنِيْ أَفْنَادًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ وَعُقْرُ دَارِ الْمُؤْمِنِيْنَ الشَّامُ)) (۱۶)

اے اللہ کے رسول ﷺ! لوگوں نے گھوڑوں کو حقیر سمجھ لیا ہے اور ہتھیار رکھ دیے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ اب کوئی جہاد نہیں ہے' جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ جنگ تو اب شروع

ہوئی ہے۔اور میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ حق پر لڑتی رہے گی اور اللہ تعالیٰ اقوام کے دلوں کو ان کے تابع کر دے گا اور اللہ تعالیٰ انہیں ان سے رزق دے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے اور اللہ کا وعدہ آ جائے۔گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک کے دن کے لیے خیر باندھ دی گئی ہے۔میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ مجھے اٹھا لیا جائے گا اور تم مختلف فرقوں کی صورت میں میری اتباع کرو گے۔اور ایک دوسرے کی گردنیں مارو گے۔ان حالات میں شام اہل ایمان کا گھر ہوگا۔''

علامہ البانی نے اس روایت کو 'صحیح' کہا ہے۔(۱۷) مختلف فرقوں سے مراد مذہبی اور جغرافیائی بنیادوں پر اُمتِ مسلمہ کی تقسیم ہے۔دورِ فتن میں مختلف مکاتب فکر کے پیروکار اور ممالک اسلامیہ کے باشندے اپنے اپنے طور اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کریں گے۔ایسے حالات میں بلادِ شام کو اہل ایمان کا وطن قرار دیا گیا ہے۔

قرب قیامت اور بلادِ شام

قرب قیامت کے حالات وواقعات میں بھی سرزمین شام کی اہمیت کئی ایک روایات میں منقول ہے۔ایک روایت میں علامات قیامت کے ظہور کے بعد شام میں قیام کی ترغیب دلائی گئی ہے۔حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر اپنے والد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((سَتَخْرُجُ نَارٌ مِنْ حَضْرَ مَوْتَ أَوْ مِنْ نَحْوِ حَضْرَ مَوْتَ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ تَحْشُرُ النَّاسُ)) قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: ((عَلَيْكُمْ بِالشَّامِ)) (۱۸)

''قیامت کے دن سے پہلے حضرموت یا حضرموت کے قریب سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو ایک جگہ جمع کرے گی''۔انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ایسے حالات میں آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ''شام کی سرزمین کو پکڑ لو!''

علامہ البانی نے اس روایت کو 'صحیح' کہا ہے۔(۱۹) اس روایت میں قرب قیامت میں سرزمین شام میں قیام کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ خروجِ دجال کے دور میں مسلمانوں کی ہجرت کی سرزمین شام ہوگی۔حضرت ثعلبہ سے مروی ہے' انہوں نے کہا کہ میں ایک دن حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے ایک خطبہ میں موجود تھا اور وہ یہ حدیث اللہ کے رسول ﷺ سے نقل کر رہے تھے:

((وَإِنَّهُ يَحْصُرُ (أى الدجال) الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ بَيْتِ الْمَقْدِسِ فَيُزَلْزَلُوْنَ

زِلْزَالًا شَدِيْدًا ثُمَّ يُهْلِكُهُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَجُنُوْدَهُ حَتّٰى إِنَّ جِذْمَ الْحَائِطِ أَوْ قَالَ أَصْلَ الْحَائِطِ وَقَالَ حَسَنٌ الْأَشْيَبُ وَأَصْلَ الشَّجَرَةِ لَيُنَادِيْ أَوْ قَالَ يَقُوْلُ يَا مُؤْمِنُ اَوْ قَالَ يَا مُسْلِمُ هٰذَا يَهُوْدِيٌّ أَوْ قَالَ هٰذَا كَافِرٌ تَعَالَ فَاقْتُلْهُ)) (۲۰)

''دجال اہل ایمان کو بیت المقدس میں محصور کر دے گا۔پس اہل ایمان اچھی طرح آزمائشوں سے ہلا مارے جائیں گے۔پھر اللہ تعالیٰ دجال اور اس کے لشکروں کو ہلاک کر دے گا۔یہاں تک کہ دیوار کی بنیاد اور حسن اشیب نے کہا ہے کہ درخت کی جڑ پکارے گی اور کہے گی: اے بندۂ مومن! یا اے بندۂ مسلم! یہ یہودی ہے' یا یہ کہے گی یہ کافر ہے' آؤ! اسے قتل کرو۔''

ایک روایت میں سرزمین شام سے چلنے والی ٹھنڈی ہواؤں کو اہل ایمان کے لیے رحمت وفضل الٰہی قرار دیا گیا ہے۔روایت کے الفاظ ہیں۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فِيْ أُمَّتِيْ فَيَمْكُثُ أَرْبَعِيْنَ ، لَا أَدْرِيْ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا أَوْ أَرْبَعِيْنَ شَهْرًا أَوْ أَرْبَعِيْنَ عَامًا ، فَيَبْعَثُ اللّٰهُ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ كَأَنَّهُ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ فَيَطْلُبُهُ فَيُهْلِكُهُ ، ثُمَّ يَمْكُثُ النَّاسُ سَبْعَ سِنِيْنَ لَيْسَ بَيْنَ اثْنَيْنِ عَدَاوَةٌ ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ رِيْحًا بَارِدَةً مِنْ قِبَلِ الشَّامِ فَلَا يَبْقٰى عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ اَحَدٌ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ أَوْ إِيْمَانٍ إِلَّا قَبَضَتْهُ ، حَتّٰى لَوْ أَنَّ اَحَدَكُمْ دَخَلَ فِيْ كَبِدِ جَبَلٍ لَدَخَلَتْهُ عَلَيْهِ حَتّٰى تَقْبِضَهُ)) (۲۱)

''دجال میری امت میں چالیس تک رہے گا۔مجھے نہیں معلوم کہ چالیس سے مراد چالیس دن' یا چالیس مہینے یا چالیس سال ہیں۔پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو بھیجیں گے جو عروہ بن مسعود سے مشابہ ہوں گے۔پس وہ دجال کو تلاش کریں گے اور اسے قتل کریں گے۔پھر لوگ سات سال تک اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے مابین بھی دشمنی نہ ہوگی۔پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا بھیجیں گے اور دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص باقی نہ رہے گا کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان یا خیر ہو' چاہے وہ پہاڑ کی کھوہ میں ہی داخل کیوں نہ ہو جائے' وہاں بھی وہ ہوا گھس کر اس کی روح قبض کر لے گی۔''

اس روایت میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت اور اس دن کی سختیاں صرف شریر لوگوں کے لیے ہوں گی اور اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اس سے پہلے ہی اٹھا لیں گے۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں' حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَتَحَوَّلَ خِيَارُ أَهْلِ الْعِرَاقِ إِلَى الشَّامِ وَيَتَحَوَّلَ شِرَارُ أَهْلِ الشَّامِ إِلَى الْعِرَاقِ)) وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((عَلَيْكُمْ بِالشَّامِ)) (۲۲)

''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ عراق کے بہترین لوگ شام اور شام کے بدترین عراق میں نہ چلیں جائیں۔ اور اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ایسے حالات میں شام میں سکونت اختیار کرو۔''

اس روایت کے مطابق قیامت سے پہلے تمام اہل ایمان شام میں جمع ہو جائیں گے۔

مذکورہ بالا روایات اور اس جیسی روایات سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ خیر و شر کے آخری معرکہ میں اصل کردار جس خطہ ارضی نے ادا کرنا ہے وہ سرزمین بلادِ شام ہے۔ بلادِ شام کی فضیلت و اہمیت' اہلِ ایمان کو دورِ فتن میں سرزمین مقدس کی طرف ہجرت کی ترغیب و تشویق' تا قیامت بلادِ شام کو اللہ کی نصرت پر مبنی مسلمانوں کی علمی و سیاسی قیادت و سیادت کا مرکز قرار دینا' دورِ فتن میں بلادِ شام کو مسلمانوں کا وطن قرار دینا' ارضِ شام میں نزولِ عیسیٰ اور ظہورِ مہدی کی خبریں وغیرہ ایسی تعلیمات ہیں جو اُمتِ مسلمہ کے عروجِ ثانی میں سرزمین شام کے فیصلہ کن کردار کا فیصلہ سنا رہی ہیں۔

واحد مسلم ایٹمی طاقت بن جانے کے بعد اس نشأۃ ثانیہ میں پاکستان کا کیا اور کتنا کردار ہوگا؟ اس بارے میں کچھ یقین سے کہنا بہت مشکل ہے۔ استاذِ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ پاکستان کے ملی کردار کے بارے میں انتہائی پرامیدی اور انتہائی مایوسی دونوں کیفیتوں کا اظہار اپنے بیانات میں کرتے چلے آئے ہیں۔ البتہ اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اس دوسری خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے فکر و فلسفہ کی بنیاد رکھنے میں برصغیر پاک و ہند کے مسلم مفکّرین کی اہمیت مسلّم ہے۔

حواشی

(۱) بسام بن خليل الصفدى' الفتن والملاحم وأشراط الساعة فى بلاد الشام' الجامعة الإسلامية' غزة' ۲۰۰۸ء' ص ۱۵-۱۸۔

(۲) جامع البيان عن تأويل آى القرآن:الأنبياء:۷۱۔

(۳) صحيحح البخارى' كتاب الفتن' باب قول النبى ﷺ الفتنة من قبل المشرق۔

(٤) سنن الترمذى' أبواب المناقب' باب فى مناقب الشام واليمن۔

(٥) السلسلة الصحيحة:٢١/٢' مكتبة المعارف' الرياض' الطبعة الأولى' ١٩٩٥ء۔

(٦) مسند احمد۔

(٧) فتح البارى: ٤٠٣/١٢' دارالمعرفة' بيروت' ١٣٧٩ء۔

(٨) سنن الترمذى' ابواب الفتن' باب ما جاء فى الشام۔

(٩) مجموع الفتاوى:٥٠٧/٢٧' مجمع الملك فهد' المملكة العربية السعودية' ١٩٩٥ء۔

(١٠) سنن أبى داؤد' كتاب الملاحم' باب خروج الدجال۔

(١١) سنن أبى داؤد' كتاب الجهاد' باب فى سكنى الشام۔

(١٢) صحيح أبى داؤد: ٢٢٤٤' مؤسسة غراس' الكويت' الطبعة الأولى' ٢٠٠٢ء۔

(١٣) سنن أبى داؤد' كتاب الجهاد' باب فى سكنى الشام۔

(١٤) السلسلة الصحيحة : ٤١١/٧-٤١٤۔

(١٥) صحيح مسلم' كتاب الفتن واشراط الساعة' باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل.....

(١٦) سنن النسائى' كتاب الخيل۔

(١٧) السلسلة الصحيحة : ٦٠٣/٤۔

(١٨) سنن الترمذى' ابواب الفتن' باب ما جاء لا تقوم الساعة حتى تخرج نار من قبل الحجاز۔

(١٩) السلسة الصحيحة:٦٣٦/٦۔

(٢٠) مسند احمد: ٣٤٩/٣٣' مؤسسة الرسالة' بيروت' الطبعة الاولىٰ' ٢٠٠١ء۔

(٢١) صحيح مسلم' كتاب الفتن' باب واشراط الساعة' باب فى خروج الدجال ومكثه فى الارض۔

(٢٢) مسند احمد: ٣٦١/٣٦۔

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے اشاعت عام: 25 روپے

رحمت کیا ہے؟

سجاد مسعود قریشی

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا﴿۲۴﴾﴾ (محمدؐ)

''کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟''—— اگر تدبّرِ قرآنی سے ہم اپنے دلوں پر پڑے تالے کھولنے کی جستجو میں لگ جائیں تو یقیناً قرآن مجید کی علمی وسعت اور حکمت نہ صرف آشکار ہوگی بلکہ باطل گمانوں کے جس گرداب میں ہم پھنس چکے ہیں اس سے نکلنے کی راہ بھی سجھائی دے گی۔ اس کے علاوہ دین حق کے سطحی مطالعہ اور فہم نے ہمیں جس بے راہ روی میں دھکیل دیا ہے وہاں سے نکلنے کی ممکن ہے کوئی سبیل نکل آئے۔

اسلام دین حق ہے اور اہلِ علم نے ''حق'' کی تعریف متنوع انداز میں کی ہے۔ میں اپنے غور و فکر کے نتیجے میں ''حق'' کی تعریف بایں الفاظ کرتا ہوں:

''حق ہر اس اٹل حقیقت کو کہتے ہیں جسے بے شک کائنات کے تمام اہل عقل جھٹلا دیں مگر علم اسے کسی طور پر بھی جھٹلا نہ سکے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ حق کی یہ تعریف میرے لیے قاسم رحمت و نعمت ﷺ کا عطیۂ خاص ہے۔ اسی کی ضد ''باطل'' کہلائے گی۔

جس حیاتِ ارضی کی بنیاد ہی حق و باطل کے تضاد و تصادم پر قائم ہو تو وہاں حق و باطل کا امتیاز کیے بغیر اندھا دھند زندگی گزارتے چلے جانا انسان جیسے عقل و فکر رکھنے والے اشرف المخلوقات کو زیبا نہیں۔ ایک طرف انسانی عقل اور قوتِ تسخیر اور دوسری طرف ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی بعثت کو دیکھیں تو عقل انسانی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

خیر و شر کی یہ دنیا درحقیقت ''رحمت'' اور ''لعنت'' کے ایک مربوط نظام پر مبنی ہے۔ رحمت اور لعنت دراصل ذات باری تعالیٰ کے دو متضاد جذبے ہیں۔ لعنت' رحمت سے محروم کر دیے جانے کا نام ہے۔ جب کسی کے لیے اس کا جذبۂ رُحمت بیدار ہوتا ہے تو اس کے لطف و کرم'

مہربانی' عفو و درگزر' بخشش اور عطا کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دنیا کی ہر نعمت اس بندے کو نہ صرف دنیوی منفعت کا فیض پہنچاتی ہے' بلکہ انہی نعمتوں کا فیض اس کی اخروی فلاح کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی انسان اپنی باطل پرستی اور فسق و فجور کے سببِ رحمت الٰہیہ سے مردود ہو کر لعنت میں مبتلا ہو جائے تو مادی دنیا کی ہر شے اس کے لیے متاعِ غرور یعنی دھوکے کا سامان بن کر اس کے لیے ذلت کے دروازے کھول دیتی ہے۔ رحمت سے دوری انسان کو دنیوی منفعتوں اور لذات میں الجھا کر عیاش بنا دیتی ہے۔ اس صورت میں ان نعمتوں کی فیض رسانی اسے دنیا کا نفع تو دے رہی ہوتی ہے لیکن وہ صریحاً آخرت کا خسارہ اٹھانے والا بن جاتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴿۲۰﴾﴾ (البقرۃ)

''پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم یقیناً گھاٹا کھانے والوں میں سے ہو جاتے۔''

تدبر قرآنی کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے محبوب مکرم ﷺ نے اسی لیے افضل ترین اعمال میں شمار فرمایا ہے کہ اس سے قرآنی فصاحت و بلاغت میں مضمر معانی کے بے کنار سمندر موجزن نظر آتے ہیں۔ چنانچہ فکر و تدبر کا ذوق رکھنے والے ہر شخص کو میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی ہر تعلیم کو فارمولوں کی صورت دیکھا' پرکھا اور سمجھا کرے۔ اس کا ماحصل بلاشبہ حقانیت کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دے گا۔ یاد رہے کہ جس تناسب سے فارمولے/ترکیب میں ردوبدل کیا جائے گا اسی لحاظ سے نتائج کی نوعیت بھی بدلتی رہے گی۔

اب ذرا مندرجہ ذیل قرآنی آیت کریمہ میں مضمر فارمولے/ترکیب کا شعوری تجزیہ فرمائیں تاکہ انسانی معاشرت پر مرتب ہونے والے اثرات کے ساتھ ساتھ رحمت اور لعنت کی حجت بالغہ قائم ہو جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (الانفال:۲۸)

''اور (اس بات کو علمی سطح پر) جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولادیں تو محض فتنہ/آزمائش/امتحان ہی ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں قرآن نے باشعور انسان کو جہاں بینی کے تمام تر بصائر کو بروئے کار لاتے ہوئے دعوتِ فکر و تدبر دی ہے۔ تمام مفروضوں سے بالاتر اگر ہم انسانی معاشروں کا شعوری

تجزیہ کرتے ہوئے انسانی سیرت اور کرداریت (Behaviorism) کا مطالعہ کریں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح اور بین الاقوامی سطح پر عیاں ہو جاتی ہے کہ مال و اولاد یا رحمت ہیں یا وبالِ جان —— آیئے دیکھتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ کی رحمت اگر شاملِ حال ہو تو انسان کیسے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جاتا ہے۔

جب اللہ الرحمٰن الرحیم کسی بندے کو ردائے رحمت میں ڈھانپ لیتا ہے تو سب سے پہلے اس کے دل سے لالچ، خود غرضی اور بخل کا رجس دھو دیا جاتا ہے۔ وہ حرام کمائی سے نفرت اور اجتناب برتنے لگتا ہے اور رزقِ حلال اس کی طمانیتِ طبع کا باعث بننے لگتا ہے۔ وہ اپنا مال عیش ونشاط میں صرف نہیں کرتا، وہ اپنے گھر کو محل سراؤں میں نہیں بدلتا، وہ محض لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے دریا دلی کا مظاہرہ نہیں کرتا، بلکہ اپنے مال کو اپنی اور انسانیت کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا ہے۔ یتیموں اور بیواؤں کی کفالت کر کے جنت میں سید کائنات ﷺ کا ہمدوش ہونے کا آرزومند رہتا ہے، بھوکے پیاسوں کی تواضع کرتا ہے، حج کرتا اور کرواتا ہے۔ الغرض اس کا مال دنیا میں ''قہاری وغفاری وقدوسی وجبروت'' جیسے اوصاف عطا کر کے اسے کردار و گفتار میں اللہ کی برہان بنا دیتا ہے۔

اس کے برعکس رحمت سے دھتکارا ہوا انسان شیطانی چنگل میں پھنس جاتا ہے اور نفسانی خواہشات کی پیروی اسے لذاتِ دنیا کا گرویدہ بنا دیتی ہے، یہاں تک کہ وہ نفس پرستی کے جنون میں آخرت سے یکسر بیگانہ ہو کر عیش جہاں کا دوام ڈھونڈنے لگتا ہے۔ بقول اقبال ؎

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام!

اس کے علاوہ اولاد اس دنیا کی عظیم ترین نعمت اور محرک (dynamism) ہے۔ اس عالم موجود میں انسان کسی بھی عمل خیر و شر کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے پیچھے کسی نہ کسی طور پر تحریکِ اولاد ہی ہوتی ہے۔ ذیل میں ہم قرآنی فارمولوں/تراکیب کے ذریعے اولاد کے رحمت یا وبال ہونے کی آگاہی کے لیے راہِ تدبر اختیار کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے دل میں یہ عقیدہ راسخ کر لے کہ حیاتِ ارضی کا مقصدِ حقیقی اس کے لیے اپنے رب کی بندگی کرنا ہے اور اس ذوق بندگی کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اپنی اولاد کو بھی منتقل کرنا ہے تو پھر وہ ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' کے ذریعے یوں رب کریم سے طلبِ رحمت کرتا ہے:

﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ (الفرقان)

''اے ہمارے رب! ہمیں ہمارے شرکاءِ حیات اور اولاد کے معاملے میں فراخی سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا دے۔''

آج ہر اسلامی معاشرہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ جو لوگ دین داری کو شعار بنا لیتے ہیں اور اپنی اولاد کی دستگیری بھی فرماتے ہیں تو ظاہراً وہ قاری نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں قرآن کا پرتو ہوتے ہیں۔ وہ سراپا عجز ہوتے ہیں، کیونکہ بندگی یا اطاعت گزاری عجز کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت، ذاتِ سید کائنات ﷺ سے عشق اور مخلوق کی فیض گستری ہی ان کی زندگیوں کا محور ہوتا ہے۔ آج پوری تاریخ انسانی گواہِ ناطق ہے کہ کل بھی اور آج بھی جہاں کہیں مخلوق کی بے لوث اور پرخلوص خیر خواہی ہوتی نظر آتی ہے، وہاں کسی اللہ والے کی کرم فرمائی نظر آتی ہے۔ یہ قرآنی فارمولے کا ایک رخ ہے۔ اس کے برعکس قرآنی فارمولا یہ ہے کہ شرابی، جواری، زانی، سود خور، غاصب، باطل پرست کبھی بھی مخلوق کی خیر خواہی نہیں کر سکتا۔ اگر ظاہراً کبھی وہ کسی فلاح و بہبود کے کام میں مشغول نظر آئے تو فوراً سمجھ لیں کہ وہ یہ کام اپنی کسی تجارتی منفعت (commercial interest) کے لیے کر رہا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ کامل ایمانداری اور غیر جانبداری سے آپ تاریخ کا تجزیہ کر لیں تو اس کا ماحصل صرف اور صرف ایک ہی ہوگا کہ ان باطل پرستوں نے ہمیشہ انسانیت کو اندھیروں میں ہی دھکیلا ہے۔ اسی لیے یہ ہمیشہ مغضوب و معتوب رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ باطل پرست قومیں اپنی کثرتِ مال و اولاد کی بدولت دنیا پرستوں کے لیے ایک مقناطیسی کشش رکھتی ہیں۔ چونکہ ان کا مطمحِ قلب ونظر اور نصب العین ہی دنیوی عیاشی ہے، لہٰذا انہیں مکمل طور پر شیطان کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ وہ ان کے اعمالِ بد کو نت نئے خیالات (ideas) سے مزین کرتا رہتا ہے اور عیش ونشاط کی نئی جہتیں متعارف کرواتا رہتا ہے۔ یہ جدت پسند اور لبرل ذہنیت کے ضالین غصب اور عیاشی کو مقصدِ حیات بنا کر تکبر و گھمنڈ کی زندگی گزارتے ہیں، کیونکہ دنیا پرستی کے لیے عجز کی نہیں بلکہ تکبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ دنیاداری بے حد پرکشش اور پرفریب ہے لہٰذا حکمت قرآنی کی صورت میں اللہ عزوجل نے ان کی اصلیت ظاہر کر کے اہل ایمان کو ان کے دامِ فریب سے بچنے کی تنبیہ بھی فرما دی:

﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ۝۵۵﴾ (التوبۃ)

''پس ان کے اموال اور اولاد آپؐ کو حیرت زدہ نہ کریں۔ بے شک اللہ کا ارادہ تو صرف یہی ہے کہ وہ انہیں انہی کے ذریعے دنیوی زندگی میں عذاب دیتا رہے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔''

آپ غور کریں کہ کس طرح اللہ احکم الحاکمین کا یہ طے شدہ امر ہے کہ جنہوں نے رحمت کی راہ اختیار نہ کی' ان کا مال اور ان کی اولاد حیاتِ ارضی میں ہی ان کے لیے باعثِ عذاب ہیں' بلکہ یہ بھی حتمی طور پر طے پا گیا کہ حالت کفر میں مرنا ان کے لیے مقدر کر دیا گیا۔ ؎

میں نے سکھلائے فرنگی کو علومِ فطرت
وہ مجھے عیش جہاں کے لیے اُکساتا ہے!
رغبتِ نفس کی تحریک کو فطرت کہہ کر
راہِ طاغوت سجا کر مجھے بہکاتا ہے! (سجاد)

یہاں بھی ہر انسانی معاشرت غماز ہے کہ جن پر رحمتوں کی کالی کملی سایہ فگن نہیں تو ان کی اولادیں باطل پرست' نفس پرست' حرام کار' بدکار' سفاک' غاصب' ناعاقبت اندیش اور مجرم ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ اس کردار کے حامل لوگ مخلوق کی خیر خواہی کسی طور کر ہی نہیں سکتے' بلکہ مخلوق کی تباہی اور بربادی کا سبب ازل سے ابد تک یہی ''حزب الشیطان'' ہوتے ہیں۔

رحمت' روحِ کائنات ہے

اب ذرا رحمت بے حد و بے کنار پر نظر ڈالیں کہ قرآن حکیم رب ذوالرحمۃ اور نبی ذوالرحمۃ ﷺ کا کیا تعارف پیش کرتا ہے:

﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ﴾ (الاعراف:۱۵۶)

''اور میری رحمت ہر شے موجود پر وسعت رکھتی ہے۔''

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝۱۰۷﴾ (الانبیاء)

''اور ہم نے آپؐ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر۔''

دونوں آیاتِ کریمہ ایک طرف تو اللہ جل شانہ اور سید کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ کی عالمینی رحمت کی آئینہ دار ہیں تو دوسری طرف یہ حجت تامہ بھی قائم کر رہی ہیں کہ اس کائناتِ موجود کی ہر وہ شے

جس کا کوئی بھی نام رکھا جا سکتا ہے رحمت کی محتاجِ مطلق ہے۔ یہی تقدیر العزیز الحکیم ہے۔ اگر رحمت ہر موجودہ شے کی ضرورت نہ ہوتی تو اللہ العلیم الحکیم کبھی بھی رحمت کو عالمینی پیمانے پر متعارف نہ کرواتا۔ درحقیقت یہی تقدیر ہے کہ رب کائنات ہر شے کو ترکیب' تدبیر' ترتیب' تناسب اور توازن کے ساتھ پیدا فرماتا ہے اور اپنے عالمینی نظام کا حصہ بنا دیتا ہے۔ یاد رہے کہ جس طرح ایک ماں ممتا کے بغیر ماں نہیں ہو سکتی اسی طرح رب رحمت کے بغیر رب نہیں ہو سکتا۔ چونکہ رحمت ہر شے کی ضرورت ہے اور ارتقاءِ حیات کے لیے ناگزیر ہے لہٰذا اللہ الرؤف الرحیم نے مخلوق پر کرم فرما کر اپنی رحمت بے پایاں کو ایک پیکر میں ڈھال دیا اور کائنات کی ساری ''کثرتیں'' اپنے محبوب ﷺ کے دامانِ مقدس میں ڈال دیں: ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۝۱﴾ (الکوثر)۔

رحمت کی ہمہ گیریت

رحمت ایک عالمینی نعمت خداوندی ہے جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہر ہست کو سرمست کیے رکھتی ہے۔ رحمت ہمہ وقت و ہمہ گیر ہے' لیکن اس سے مستفید ہونے کے لیے مؤمن (باعمل مسلمان) ہونا شرط ہے۔ باطل پرست قلوب کو یہ ہر چند سیراب نہیں کرتی۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ہمارے زمینی ماحول میں آکسیجن ایک جاں فزا عنصر کی طرح ہر جگہ موجود ہے۔ اسی کی بدولت جاندار سانس لیتے ہیں اور زندہ گردانے جاتے ہیں' مگر غور کریں کہ ایک شخص مردہ حالت میں آپ کے سامنے پڑا ہے اور جاں افزا آکسیجن کی لہریں اب بھی اس کے نتھنوں سے ٹکرا رہی ہیں' مگر وہ ان سے کیونکر مستفید ہو سکتا ہے؟ چونکہ کفار اور مجرمین کے دل مردہ ہوتے ہیں اس لیے رحمت سے سیراب نہیں ہوتے اور اللہ کی ناپسندیدہ دنیا سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں' باوجود اس آگہی کے کہ دنیا فانی و عارضی ہے۔ اور جب رحمت شامل حال ہو تو قلب میں حمد و نعمت کے ترانے گونجتے ہیں۔

قرآن اور وسعتِ رحمت

ذیل میں قرآن حکیم کے حوالے سے لامتناہی فیضانِ رحمت کا تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ اہلِ ایمان کو رحمتِ حق کی کچھ آگاہی ہو سکے۔ قرآنی آیات کے حوالے دینے سے دانستہ گریز کیا جا رہا ہے تاکہ طوالتِ نفس مضمون سے بچا جا سکے۔

سب سے پہلے تو اس عقیدے کو اپنے دلوں میں مزیّن کر لیں کہ اس کائنات میں صرف

تین ذاتیں عالمینی حیثیت کی حامل ہیں: (۱) رب العالمین عزوجل، (۲) رحمۃ للعالمین علیہ التحیات والسلام، اور (۳) قرآن ذکر وللعالمین۔ ان تینوں ذاتوں کی عالمینی حیثیت انہیں ہر طرح کے تقابل وموازنے سے مستثنیٰ قرار دیتی ہے۔ یہی ازلی حق ہے کہ ان اعلیٰ ذاتوں کا نہ کوئی مقابل ہے، نہ کوئی مماثل اور نہ کوئی عدیل۔ ع ''اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم!'' ان تینوں ذاتوں میں قدر مشترک بھی یہی ہے کہ تینوں عالمی سطح پر رحمتوں کی فیض رساں ہیں۔

یہاں ایک اور اہم عقیدہ بھی ذہن نشین رہے کہ اپنی عالمینی رحمتوں سے مخلوق کو بہرہ مند فرمانے والے کے لیے شرط ہے کہ خلق کا ہر ہر ذرہ اور ہر ہر فرد نہ صرف اس کی نگاہ میں ہو بلکہ وہ اس کی حالت زار سے مکمل آگاہ بھی ہو۔

اللہ جل شانہ کی وحدت رحمت ہے۔ شرک کی لعنت سے گزر کر توحید پرستی رحمت ہے۔ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کی نبوت و رسالت رحمت ہے۔ قرآن مجید اور دیگر الہامی کتب (بلاتحریف) رحمت ہیں۔ قرآن کی حکمتیں رحمت ہیں۔ قرآنی ہدایت رحمت ہے، نور رحمت ہے، علم رحمت ہے۔ رحمت باعثِ فرحت و راحت وطمانیت ہے۔ رحمت درحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ کے خزانے ہیں۔ اللہ عزوجل اور رسول عربی ﷺ کا ذکر رحمت ہے۔ مردہ زمین کو حیات بخشنا رحمت ہے۔ رحمت سے جہاں بینی کے بصائر نصیب ہوتے ہیں۔ رحمت سے تابانیٔ شمس وقمر قائم و دائم ہے۔ رحمت سے اطاعت نصیب ہو رہی ہے۔ رحمت سے ذوقِ عبادت میسر ہے۔ فلاحِ اخروی کا انحصار رحمت پر ہے۔ بدترین مجرم اور گناہگار کے لیے بھی رحمت سے مایوسی حرام ہے اور رحمت ایسے شخص کے لیے بھی اُتنی امید افزا ہے کہ وہ ندامت کے آنسوؤں سے گناہوں کو دھو کر ولایت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوسکتا ہے۔ دنیوی متاعِ غرور جمع کرنے سے رحمت کہیں بہتر ہے۔ دائرۂ رحمت میں داخل ہونے والے کو شر اور فساد سے محفوظ فرما دیا جاتا ہے۔ دائرہ رحمت میں داخل ہونے والے کے نہ اعمال اکارت جاتے ہیں اور نہ ہی اس کا ایمان واجر ضائع کیا جاتا ہے۔

اللہ ذوالجلال والاکرام رحمت فرما دے تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیٹے اور بھائی کو بھی نبیؑ بنا دیتا ہے، جیسا کہ حضرت اسماعیل اور ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کو۔ رحمت کی کالی کملی میں سما جانے والے صدیق، فاروق، غنی، مرتضیٰ، شہید، صالح، ابرار، غوث، اوتار، قطب، ولی اور ابدال بن جاتے ہیں۔ رحمت حق شامل حال ہو جائے تو رب العزت اپنی ملکوت کائنات کے راز افشا

فرما دیتا ہے۔ رحمت کی نگاہ میسر آ جائے تو ساغر کوثر کے جام پلوا دیتی ہے۔ رحمت اگر محبت کا ہاتھ بڑھا دے تو محسنین میں شامل فرما کر معصوم ومحفوظ بنا دیتی ہے۔

رحمت سے قلوب کو خشوع وخضوع نصیب ہوتا ہے۔ رحمت شیطان لعین ومردود جیسے عدو مبین کے خلاف ڈھال بن جاتی ہے۔ رحمت کی بدولت جاں فزا ہوائیں کرۂ ارض پر بقاءِ حیات کی ضامن بن کر اور سمندروں میں جہاز رانی کو مستفید فرما کر انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل سے مالا مال کر رہی ہیں۔ توبہ کی توفیق رحمت سے نصیب ہوتی ہے۔ رات کو سکون اور دن کو فضل ربی کی جستجو کا ذریعہ بھی رحمت ہے۔ میاں بیوی کے درمیان محبت ومودت بھی رحمت کی مرہون ہے۔

حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صبر بھی رحمت ہے اور اس آزمائش سے خلاصی بھی رحمت۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کا تعمیر کعبہ پر مامور ہونا بھی رحمت، تعمیر کو تکمیل تک پہنچانا بھی رحمت اور بطور جزا رحمت للعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو طلب فرمانا نہ صرف رحمت بلکہ تمام آئندہ نسلوں پر احسان عظیم ہے۔ بندگانِ حق کا گمانوں سے گزر کر حق کی طرف بڑھنا رحمت۔ کاملین کی دستگیری نصیب ہونا رحمت۔ اللہ الغفور الرحیم کا معاملات میں تخفیف فرمانا رحمت۔ رحمت سے شرحِ صدر مقدر ہوتی ہے۔ خیر وشر کی اس دنیا میں دلوں کی کجی رحمت سے 'حنیف' بنتی ہے۔ روزِ محشر فوزِ عظیم پانے والوں کے چہرے رحمت ہی کی بدولت تاباں ومستنیر ہوں گے۔ مردانِ حق کے درجات میں ترقی رحمت سے ہے۔ بھوک اور پیاس رحمت سے بجھتی ہے۔ دائرہ رحمت میں داخل ہونے والوں کو بشارتیں نصیب ہوتی ہیں۔

رحمت سے مرحلۂ ولادت طے ہوتا ہے۔ رحمت ہی سے نطفہ جاندار وجود میں ڈھلتا ہے۔ رحمت سے زندگی مل رہی ہے۔ رحمت سے زندگی برقرار رہے۔ رحمت سے رزق مل رہا ہے۔ رحمت سے شفا مل رہی ہے۔ رحمت سے ممتا، شفقت، مہربانی، لطف وکرم، بھائی چارہ، محبت اور برکت مل رہی ہے۔ رحمت سے مصیبتیں ٹل رہی ہیں۔ رحمت سے چارہ سازی، اعانت وتعاون مل رہے ہیں۔ رحمت سے اہل ایمان صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ رحمت سے اسلام، ایمان اور احسان میسر ہے۔ رحمت سے عشق وفقر میسر ہے۔ رحمت سے نیکی کی توفیق مل رہی ہے۔ رحمت سے صالح اولاد نصیب ہو رہی ہے۔ رحمت سے رزقِ حلال نصیب ہو رہا ہے۔ رحمت سے دلوں

(باقی صفحہ 62 پر)

انسانیت کی معراج

راحیل گوہر

قرآن عظیم نے انسان کا ایک متحرک تصور پیش کیا ہے جو کائنات کی بے کراں وسعتوں کو مسخر کرنے کی پوری اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہے —— وہ اپنی قوتِ مدرکہ (faculty of perception) سے کائنات کے سربستہ رازوں کو افشا کرنے کی دھن میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔ اس قوتِ مدرِکہ ہی کو وجدان (intuition) کہتے ہیں اور یہ وجدان ہی انسان کی اپنی ذات کی معرفت کا باعث ہوتا ہے۔ اپنی ذات کی شناخت ہی کٹھن مرحلہ ہے۔ انسان کے جسد خاکی میں ایک عالم پنہاں ہے جس میں روح و بدن کی بقا کے لیے مکمل لوازمات بھی ہیں اور خیر و شر کی معرفت کا فہم بھی بالقوہ (potentially) موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ (الشمس)

''اور نفس انسان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا۔ پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔''

قرآن کا مطلوب یہ سیماب صفت انسان ہی ہے جو اپنی ذات میں جھانک کر اپنے وجود کی گہرائیوں میں اُتر کر قدرت کی ودیعت کی ہوئی خفتہ صلاحیتوں کی پہچان حاصل کر لیتا ہے اور زندگی کے حرکی تصور سے روشناس ہوتا ہے۔ خالق کائنات کا حقیقی منشا بھی یہی ہے۔ بقول اقبال ع ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!''

قرآن عظیم نے نفس انسانی کے تین ارتقائی درجات (evolutionary stages) بیان کیے ہیں: پہلا درجہ نفس امارہ کا ہے۔ جب انسان اپنے مادی اور خاکی وجود کی سیوا میں منہمک ہو جاتا ہے، دنیا و مافیہا سے نچنت ہو کر اپنی ہی ذات کا طواف شروع کر دیتا ہے تو اس کی روح مضمحل ہونے لگتی ہے۔ جسمانی لذات و شہوات اس کا مطلوب و مقصود بن جائے تو انسان کا روحانی ترفع رک جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو قرآن عظیم نے ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''نفس (امارہ) تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے'' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ دوسرا درجہ نفسِ لوّامہ کا ہے۔ یہی وہ درجہ ہے جب نفسانی اور حیوانی تقاضوں تلے سسکتی

روح کی آبیاری کا پاکیزہ جذبہ انسان کے اندر انگڑائی لے کر بیدار ہوتا ہے اور ع ''اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن'' کے مصداق اپنے خالق و مالک کی طرف اس کے میلانِ طبع کا سفر شروع ہوتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان نفس لوامہ کے حصار میں آ جاتا ہے۔ چنانچہ جب بھی نفس امارہ اسے برائی کی طرف راغب کرتا ہے تو یہی نفسِ لوّامہ اس کے سامنے ڈھال بن جاتا ہے۔ پھر اس کی کیفیت کچھ یوں ہوتی ہے کہ ع ''ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر'' —— اس ایمان اور مادیت کی کشمکش میں جب انسان کے عقائد و نظریات پر، اس کے فکر و عمل پر قوتِ ایمانی غالب آ جاتی ہے تو اس کو وہ مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو انسانیت کی معراج ہے، جسے قرآن عظیم نے نفسِ مطمئنہ کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝﴾ (الفجر)

''اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔''

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم اپنی تصنیف ''قرآن اور علم جدید'' میں لکھتے ہیں: ارتقا کا عمل، جس سے انسان کامل سے کامل تر ہوتا جا رہا ہے، ایک ایسا عمل ہے جس سے ایک طرف خدا اور اپنے آدرش کو حاصل کر رہا ہے اور دوسری طرف انسان کے کامل سے کامل تر ہونے کے معنی یہی ہیں کہ وہ اس طرح کا ہی ہو جائے جس طرح اللہ تعالیٰ اسے بنانا چاہتا ہے۔ یعنی اپنی فطری استعداد کے مطابق اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق اور اس کے اوصاف سے متصف ہو جائے —— آئن سٹائن ہمیں بتاتا ہے کہ روشنی کی کرنیں ایک خط مستقیم میں حرکت نہیں کرتیں بلکہ روشنی کی ہر کرن ایک بہت بڑا دائرہ بنا کر وہیں پہنچنا چاہتی ہے جہاں سے چلتی ہے۔ اسی طرح درخت بیج سے چلتا ہے اور بیج پر پہنچتا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات اس مضمون پر روشنی ڈالتی ہیں کہ انسانِ کامل خدا کا آدرش ہے اور خدا اسی سے محبت کرتا ہے جو اس کی جستجو کر رہا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵۷)

''اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لاتے ہیں (یعنی اللہ سے محبت کرتے ہیں) وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔''

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ ''اخلاق اور فلسفہ اخلاق'' میں حضرت علی ؓ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپؓ نے فرمایا:

''انسان کے دل میں ایمان شروع میں ایک سفید نقطے کی طرح ظاہر ہوتا ہے اور جوں جوں ایمان میں ترقی ہوتی ہے سفید نقطہ آہستہ آہستہ پھیلتا جاتا ہے۔ اور جب کامل الایمان ہوجاتا ہے تو انسان کا تمام قلب نورانی اور روشن ہوجاتا ہے۔''

انسان کے اسی ترفع' بڑائی اور مقام فضیلت کی وجہ سے ابلیسی قوتیں اسے شرفِ انسانیت سے نکال کر قعرِ مذلت میں پھینک دینا چاہتی ہیں۔ ان سفلی قوتوں کا پہلا وار انسان کے قلب پر قنوطیت (pessimism) کی صورت میں ہوتا ہے جو اس کی قوت محرکہ کو غیر فعال بنا دیتا ہے۔ قنوطیت انسان کو فرار (flee) کی راہ سجھاتی ہیں۔ قنوطیت کی بہترین مثال آرتھر شوپن ہار کا فلسفۂ حیات ہے جو زندگی کو ایک اذیت اور کرب (agony) تصور کرتا ہے۔ اس کٹھن مقام پر بھی قرآنِ عظیم انسان کی بھرپور رہنمائی کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۳﴾﴾ (الزمر)

''اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے' اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ (اور) وہ تو بخشنے والا' مہربان ہے۔''

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق یہی ہے کہ حیوان محض اپنی جبلّت (instinct) کے تحت عمل کرتا ہے۔ اس کا دیکھنا' سننا' محسوس کرنا غیر شعوری طور پر جبلی تقاضوں کی تکمیل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا ہر عمل ارادی طور پر خود شعوری اور خود آگہی کے کلی احساس کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔

قرآن عظیم نے اگر ایک طرف انسان کی مثالی (out standing) اور قابل قبول شخصیت کے مثبت (positive) پہلو کو اُجاگر کیا ہے تو دوسری طرف اس کے سلبی (negative) رخ کی انتہائی لرزا دینے والے الفاظ میں نقشہ کشی کی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿لَہُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَہُوْنَ بِہَا ۡ وَلَہُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِہَا ۡ وَلَہُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِہَا ؕ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ہُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾﴾ (الاعراف)

''ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں' ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں' ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل) چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے

بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

قرآن عظیم بنی نوعِ انسان کے لیے زندگی کا ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر رہنمائی اور دستگیری کے لیے یہ ہدایتِ تامّہ ہے جو مطلوب ایمانِ کامل کے حصول کے لیے ایک روشن شمع اور ایک زبردست قوتِ محرّکہ ہے۔ اس حوالے سے غور طلب پہلو یہ ہے کہ اگر شاہراہِ حیات پر دور و یہ اَن گنت شمعیں فروزاں ہوں اور پھر بھی انسان کو سیدھا راستہ سجھائی نہ دے تو یہ اس کی اپنی کوتاہ نظری ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ جس کی پذیرائی کے لیے بچھا ہوا ہو' جسے قدرت نے مسجودِ ملائک کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کیا ہو' وہ خود ہی اپنی حقیقت سے ناآشنا ہو تو اس انسان کی حیثیت برسات کے اس پہلے قطرے کی مانند ہے جو سیپ کے منہ میں گرتا تو ضرور ہے مگر قطرہ سے گہر ہونا اس کے نصیب میں نہیں ہوتا ؎

نہ ہو نومید' نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمیدِ مردِ مؤمن ہے خدا کے راز دانوں میں!

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

والدین کے حقوق

(گزشتہ سے پیوستہ)

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

حقوقِ والدین کی اہمیت: قرآنی آیات کی روشنی میں

ذیل میں والدین کے حقوق سے متعلق آیات کو بیان کیا جا رہا ہے۔ ان آیات کو بغور پڑھیں اور سوچیں کہ آیا ہم حقوق العباد میں سے بلندترین رتبے کا حق ادا کر رہے ہیں یا نہیں؟

بنی اسرائیل: ۲۳، ۲۴: ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝۲۳ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝۲۴﴾ (بنی اسراءیل)

’’اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرنا۔ اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو اور ان کے حق میں دعا کرو کہ اے پروردگار جیسے انہوں نے بچپن میں (شفقت سے) میری پرورش کی اسی طرح تو بھی ان کے حال پر رحم فرما۔‘‘

ذیل میں اس آیت کا عام فہم مفہوم بیان کیا جاتا ہے:

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ : ’’پس ان کو اُف تک نہ کہو‘‘ یعنی ان کی نصیحت اور خیر خواہی کے ردِعمل کے طور پر یا ہماری مرضی کے مطابق بات نہ مانے جانے پر ناک منہ چڑھانا‘ اُف کہنا یا آپ کی باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں‘ جیسے جملے اس میں شامل ہیں۔ لہٰذا اولاد کو ان سے گریز کرتے

ہوئے خاموش رہنا چاہیے۔

وَلَا تَنْهَرْهُمَا : ’’اور ان کو ڈانٹیں نہیں‘‘ یعنی اپنی مصروفیت یا کسی اور مشغلے میں والدین کی طرف سے کسی کام کے آ جانے سے جھنجھلا کر ان کو ڈانٹ دینا یا جھڑک دینا یا ان سے کہنا کہ آپ کے کام ختم ہی نہیں ہوتے‘ اس سے ہمیں اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا۔ اسی طرح اگر والدین بلا رہے ہوں اور اولاد کسی عبادت یا ذکر و اذکار میں مصروف ہو تب بھی احسن طریقے سے جواب دینا چاہیے نہ کہ اپنی دینداری اور تقویٰ کا رعب جھاڑ کر ان کو چپ کرا دیا جائے۔ یہ یاد رکھیں کہ اولاد کی تمام نیکیاں ضائع ہونے کے لیے اُن کی طرف سے والدین کو چھوٹی موٹی ڈانٹ ہی کافی ہے۔

وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا : ’’اور ان کی ہر بات کا جواب نرمی سے دیں‘‘ یعنی ہر حال میں والدین کے ساتھ خوش اخلاق اور خوش گفتار رہا جائے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ : ’’ان کے لیے عاجزی سے کندھے جھکا کر رکھو‘‘۔ مندرجہ بالا احکام و آداب میں سے یہ ایک درجہ مزید افضل مقام ہے کہ اولاد کے لہجے کے ساتھ ساتھ چہرے کے تاثرات سے بھی کوئی ناگواری کے اثرات ظاہر نہ ہوں بلکہ خوش گفتاری اور بہترین عمل کے ساتھ انداز بھی عاجزانہ ہو۔ پھر اولاد انکساری کا ایسا نمونہ بن کر دکھائے جیسے والدین اولاد کے بچپن میں اپنی ہر خواہش سے زیادہ اولاد پر مہربان ہوتے تھے۔

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا : مزید یہ کہ والدین کے لیے دعا بھی کرتے رہیں کہ اے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔ یعنی جب میں کمزور اور ناتواں تھا‘ بے سمجھ اور بے عقل تھا تب میرے والدین نے مجھے بہت محبت و شفقت سے سنبھالا اور میری پرورش میں کوئی کمی نہیں آنے دی‘ آج جبکہ وہ کمزور اور ناتواں ہیں تو تو ان پر رحم فرما —— والدین کے لیے دعائیں بھی درحقیقت اولاد کی بہتری کے لیے ہی ہیں کہ اگر اولاد سے والدین کی خدمت میں کوئی کمی بیشی ہو جاتی ہے تو دعاؤں کے ذریعے یہ کمی پوری ہوسکتی ہے۔ اگر انسان والدین کے بارے میں کوتاہی برتتا ہے تو اس کا انجام ایک حدیث میں بایں طور موجود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک صحابی کو لایا گیا جن پر نزع کا عالم طاری تھا‘ لیکن جان نہیں نکل رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے والدین کا نافرمان ہے اور اس کی ماں اس سے ناراض ہے۔ اس کی والدہ کو بلایا گیا اور کہا گیا کہ اس کو معاف کر دیں۔ ماں نے انکار کر دیا

تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا آگ جلاؤ اور اسے آگ میں ڈال دو۔ یہ سن کر ماں کا دل نرم پڑا اور انہوں نے بیٹے کو معاف کر دیا۔ تو ان کے منہ سے کلمہ بھی نکلا اور روح بھی پرواز کر گئی۔

درحقیقت آخرت میں تو کامیابی کی منزلیں حقوق العباد خصوصاً والدین کی خدمت سے طے ہوتی ہیں' لیکن دنیا کی کامیابی اور دنیا کی زندگی میں بھی سکون اور چین والدین کی خوشنودی اور رضامندی میں ہے۔ والدین کو نظر انداز کرنے سے یقیناً احساس کی شدت یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے اور ضمیر کے کچوکے بھی چین نہیں لینے دیتے کہ تم نے اپنی ماں کو ستایا' باپ کو دھتکارا تو آج اس کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے کہ نہ دن کو چین ہے اور نہ رات کو سکون۔ اعاذنا اللہ منھا۔

لقمٰن:۱۴'۱۵: ﴿.....اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ (لقمٰن)

''.....تا کہ میرا بھی شکر کرتا رہے اور اپنے ماں باپ کا بھی۔ تم کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہنا نہ ماننا' ہاں دنیا (کے کاموں) میں ان کا اچھی طرح ساتھ دینا' اور جو شخص میری طرف رجوع کرے اس کے رستے پر چلنا۔ پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے' پس میں آگاہ کروں گا تمہیں ان کاموں سے جو تم کیا کرتے تھے۔''

ذیل میں اس آیت کے چند اہم حصوں کا عام فہم مفہوم بیان کیا جا رہا ہے:

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ: ''میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا''—— اللہ کا شکر ہر چیز پر غالب رہے گا کہ اُسی کی توفیق اور اُسی کی عطائیں ہیں جو ہم دنیا میں ہر طرح کی نعمتیں اور والدین کی شکل میں اللہ کی رحمتیں اکٹھی کر رہے ہیں۔ میرے ابی جان ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے بقول اللہ کا شکر تین انداز سے ادا ہوتا ہے: شکر بالقلب' شکر باللسان اور شکر بالجوارح۔ یعنی دل میں اللہ کی تمام نعمتوں کا احساس ہونا' زبان پر ہر وقت اللہ کی تعریف کا رہنا اور عملی طور پر تمام معاملات اللہ کے حکم کے مطابق سرانجام دینا—— اس کے ساتھ والدین کا شکر بجالانا بھی ضروری ہے' اس لیے کہ انہوں نے بچپن سے لے کر آج تک کی ہماری تمام تر کامیابیوں اور ہماری جسمانی و روحانی تربیت کی خاطر ہر موقع پر اپنے آرام و سکون کو پس پشت ڈال کر ہمارا

خیال رکھا۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا: ''اگر وہ دونوں (والدین) تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ اُسے شریک ٹھہرا جس کا تیرے پاس علم نہیں ہے تو ان کا کہنا نہ مان''۔ آیت کے اس حصے میں ایک اٹل حقیقت کی جانب رہنمائی کی جا رہی ہے ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)) یعنی ''اللہ تعالیٰ کی معصیت میں مخلوق میں سے کسی کا بھی کہنا نہ مانا جائے''۔ والدین اگر اُن امور کا حکم دیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے مثلاً خدا پرستی کی بجائے مزار پرستی' نفس پرستی وغیرہ کی طرف بلائیں یا شیطانی کاموں مثلاً بے حیائی' فحاشی یا بے انتہا فضول خرچی کا حکم دے رہے ہوں تو اس بارے میں ان کی اطاعت نہ کی جائے۔ اطاعت کے حوالے سے یہ قاعدہ کلیہ یاد رکھیں کہ کلی اطاعت صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہوگی۔ باقی تمام کی اطاعت اللہ کے حکم کے مطابق اور اللہ کے حکم کے ماتحت ہوگی۔ اگر والدین ایسا کوئی حکم دیں تو یہ اولاد کا فرض ہے کہ وہ والدین کو اطاعتِ الٰہی کی طرف اچھے طریقے سے مائل کریں۔

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا: ''اور ان کے ساتھ دنیا میں معروف طریقے سے زندگی گزارو''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک اور کافر والدین کے ساتھ بھی اچھے طریقے سے رہنے کا حکم ہے۔ دنیا کے معاملات' جن میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو رہی ہو' ان میں ان کا کہا ماننا اولاد کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے' لیکن جہاں اللہ کا حکم اور والدین کا حکم ٹکرا رہا ہو تو وہاں ہمیشہ اللہ کے حکم کو ترجیح دینی چاہیے۔

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ: ''اور پیروی اُس شخص کے راستے کی کرو جو میری طرف بلاتا ہو''۔ یہاں واضح طور پر یہ فرما دیا گیا کہ والدین کی اطاعت اس وقت تک ہوگی جب تک وہ اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں۔ سورۂ لقمان (منتخب نصاب) کی تشریح کرتے ہوئے والد محترمؒ نے شرک کی مختلف اقسام بیان کی ہیں اور پھر بہت اچھے طریقے سے سمجھایا ہے کہ اطاعت' محبت اور حکم جب تک اللہ کی عائد کردہ حدود کے تابع رہے تو ضرور کرو لیکن جہاں اللہ کے احکامات پامال ہو رہے ہوں وہاں اطاعت نہیں ہوگی۔ اس حوالے سے والد محترم کی کتاب ''حقیقت و اقسام شرک'' کا مطالعہ مفید رہے گا۔

اس حوالے سے یہ یاد رکھیں کہ انسان ہونے کے ناطے بسا اوقات والدین سے غلطیاں

بھی سرزد ہوسکتی ہیں' وہ زیادتی کے بھی مرتکب ہوسکتے ہیں اور اولاد کے حقوق کے ضمن میں ان سے حق تلفیاں بھی ہوسکتی ہیں تو بالترتیب عفوودرگزر' دعائے استغفار' ترغیب وتشویق اور انذار وترہیب کے ذریعے سے حق بات کی نشاندہی تو لازم ہے ہی' لیکن والدین سے کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی' بدکلامی یا غصے کا اظہار کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ایسے مواقع پر والدین کو احسن طریقے اور حکمت سے سمجھانا اولاد کا فرض ہے' لیکن اگر والدین پھر بھی اسی روش پر قائم رہیں اور اولاد کو بھی غلط بات کا حکم دیں تو ان کا کہا بالکل نہ مانو' بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم بالا رکھو۔

بنی اسرائیل:۲۵:﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ﴾:''تمہارا رب تمہاری دلی کیفیت کو خوب سمجھتا ہے''۔بعض اوقات مندرجہ بالا صورتحال میں' جب والدین کسی غلط بات کا حکم دے رہے ہوں اور اولاد حکم عدولی کر رہی ہو' تو والدین کی طرف سے سختی' قطع تعلقی کی دھمکیاں' جائز حقوق کو بھی غصب کر لینے اور اپنا دودھ نہ بخشنے کی دھمکیوں تک کی نوبت آ سکتی ہے' لیکن اولاد کو ثابت قدمی سے حق پر قائم رہنا چاہیے۔ہوسکتا ہے کہ اولاد کو نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے حالات میں والدین کے ساتھ سختی کرنا پڑے۔اس بارے میں فرمایا گیا کہ تمہارا رب تمہارے دلوں کے حال سے پوری طرح باخبر ہے۔

اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا:''اگر تم نیکی کی روش اختیار کرتے رہو تو وہ ذات اپنے توبہ کرنے والے بندوں کو معاف کرنے والا ہے''۔یعنی اگر والدین کے سامنے نہ چاہتے ہوئے بھی (ان کے اپنی ضد پر قائم رہنے کی وجہ سے) کسی طرح کی سختی کی نوبت آ جائے تو پھر اپنے لیے استغفار کرنا بے حد ضروری ہے۔

آباء پرستی کی ممانعت

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بے حد ضروری ہے۔وہ یہ کہ اکثر اوقات ہم اپنے آباء واَجداد کی تعریف کرنے میں نہ صرف زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں بلکہ ان کی کسی بات کو ردّ نہیں کرتے اس یقین کے ساتھ کہ جو ہمارے بڑے کہہ گئے ہیں وہ حرفِ آخر ہے۔بہت سے گھرانوں میں تو یہاں تک ہوتا ہے کہ گناہ کے کام کر کے بہت اطمینان سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے بڑے ایسے ہی کرتے تھے۔اسی طرح بدعات میں (جانتے بوجھتے کہ یہ سب گناہ کے کام ہیں) شریک ہوتے ہیں اور یہی جاہلانہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہمارے ماں باپ کا حکم ہے۔گویا وہ اللہ کے حکم کو اپنے والدین کے حکم سے نیچے رکھتے ہیں۔والدین کی اندھی تقلید آباء

پرستی کہلاتی ہے اور قرآن پاک میں جہاں والدین کی اطاعت کا حکم بار بار آیا ہے' وہیں والدین اور آباء واجداد کی اندھی تقلید پر بہت سخت وعید بھی آئی ہے۔سورۃ الصّٰفّٰت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾﴾

''بھلا یہ مہمانی اچھی ہے یا تھوہر کا درخت؟ ہم نے اس کو ظالموں کے لیے عذاب بنا رکھا ہے۔وہ ایک درخت ہے کہ جہنم کی گہرائی میں اُگے گا۔اس کے خوشے ایسے ہوں گے جیسے شیطانوں کے سر۔سو وہ اسی میں سے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے۔پھر اس (کھانے) کے ساتھ ان کو گرم پانی ملا کر دیا جائے گا۔پھر ان کو دوزخ کی طرف لوٹایا جائے گا۔انہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ ہی پایا۔سو وہ انہی کے پیچھے دوڑے چلے جاتے ہیں۔''

اس آیت میں لفظ ''ضالین'' ہے' یعنی والدین کافر یا مشرک نہیں بلکہ گمراہ تھے اور بدعات میں پڑے ہوئے تھے اور اپنی اصل راہ (صراطِ مستقیم) گم کر بیٹھے تھے' جس کی وجہ سے نہ خود ہدایت پر تھے اور نہ ان کی اولاد کو شریعت کا اتنا علم تھا کہ وہ ان گمراہیوں کی پیروی نہ کرتے۔

سورۃ المائدۃ میں فرمایا:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ اللہ کے رسول کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا۔اگرچہ ان کے آباء واَجداد نہ کچھ جانتے ہوں اور نہ ہی ہدایت پر ہوں!''

سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس کی جو اللہ نے نازل کیا تو کہتے ہیں کہ ہم تو پیروی کریں گے اس کی جس پر ہم نے اپنے آباء و اَجداد کو پایا۔ اگرچہ ان کے آباء و اَجداد نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں!''

سورۂ لقمان میں فرمایا:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۲۱﴾﴾

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس کی جو اللہ نے نازل کیا تو کہتے ہیں کہ ہم تو پیروی کریں گے اس کی جس پر ہم نے اپنے آباء و اَجداد کو پایا۔ اگرچہ شیطان ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو!''

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ والدین کی اندھی تقلید ضلالت بھی ہے' بے وقوفی بھی اور شیطانی حربہ بھی۔ اللہ کا حکم سمجھتے ہوئے والدین یا بڑوں کا ادب و احترام' ان کی عزت کا خیال' ان سے ہمدردی' ان کی خدمت کرنا' ان سے محبت کرنا' اللہ کے ہاں اجرِ عظیم کا باعث ہے' لیکن رسومات و بدعات اور گناہ کے کاموں میں یا شیطانی اعمال میں ان کی اطاعت کرنے کی بجائے خود سیدھے راستے پر چلنا اور والدین کو بھی باحسن صراطِ مستقیم پر چلانے کی کوشش کرنا اللہ کے ہاں مطلوب و مقصود بھی ہے اور نجاتِ اخروی کے لیے لازمی و لابدی بھی۔ دوزخ کی آگ سے خود بچنا اور دوسروں کو بچانے کی کوشش کرنا ہم سب پر فرض ہے۔ خصوصاً الاقرب فالاقرب کے اصول کے مطابق قریب ترین رشتہ داروں کو سب سے پہلے خبردار کرنا فرض ہے۔

والدین کی حق تلفیوں پر آواز اُٹھانا بھی لازم ہے!

انسان ہونے کے ناطے ہر ایک سے حقوق العباد میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ عورت ہی دوسری عورت کا گھر اجاڑنے کا باعث بنتی ہے۔ ساس بہو کے معاملات ہوں یا نند بھاوج کے' بسا اوقات اچھی بھلی سمجھ بوجھ رکھنے والی خواتین جب اس رشتے میں بندھ جاتی ہیں تو خود اپنی زندگی بھی جہنم بنا لیتی ہیں اور گھر والوں کی بھی۔ ایسے نازک حالات میں جب گھر جھگڑے اور فساد کا اڈا بن جائے' اولاد کا حق پر قائم رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور وہ ایک

دوسرے کا منہ رکھنے کے لیے جائز ناجائز' حق ناحق سب ہضم کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ بہت ہی غلط بات ہے اور یہی حقوق العباد ہیں جو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا جب تک بندے خود ایک دوسرے کو معاف نہ کر دیں۔ نیک اولاد کا فرض بنتا ہے کہ گھر والوں اور والدین میں سے جو زیادتی پر ہوں ان کو سمجھائیں' حق بات کی طرف احسن طریقے سے راغب کریں۔ یہ سوچ کر نہ چپ رہ جائیں کہ میرے والدین جو کر رہے ہیں وہ ٹھیک ہے یا میں تو اپنے والدین کو سمجھا نہیں سکتا۔ قرآن پاک کی رہنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ حق بات کہو چاہے تمہارے خلاف ہو یا تمہارے والدین کے۔ حق کی گواہی دینا ہم سب پر فرض ہے۔ چنانچہ خاموشی سے گھر میں ظلم یا فساد برداشت کرتے رہنا یا والدین کی طرف سے خدانخواستہ حق تلفیوں کے باوجود خاموش تماشائی بنے رہنا بہت غلط طرزِ عمل ہے۔ عمر کا آخری حصہ احساسات کے باعث بہت نازک ہوتا ہے۔ عام طور پر عمر کے اس حصے میں نفس کے تقاضے غالب آ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس طرح کی خواہشات سامنے آتی ہیں کہ کھانے کو اچھا ملے خواہ ڈاکٹر نے پرہیز بتائی ہو' بس میرا حکم ہی اس گھر میں نافذ ہو چاہے اللہ کا حکم پس پشت رہ جائے' بیٹا میری مرضی کے بغیر اِدھر اُدھر نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ والدین ساری عمر اپنا حق بھی اپنی اولاد کو دیتے رہے' لہٰذا اب وہ اِس دَور میں اپنا حق بھی پورا پورا وصول کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں کے حقوق کی بھی پروا نہیں کرتے۔ بسا اوقات گھر میں رنجشیں اور دوریاں اور ذہنی اور نفسیاتی بیماریاں صرف اس وجہ سے جنم لیتی ہیں کہ نماز روزے کے تو پابند ہیں لیکن انسانوں کے حقوق نہیں جانتے۔ ایسی تمام صورتوں میں اولاد کو والدین کی مدد کرنی چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم''۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ظالم کی مدد کیسے کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ظالم کو اس کے ظلم سے روکنا اس کی مدد ہے''۔ اسی طرح والدین کو احسن طریقے سے احکاماتِ شریعت پر عمل کی ترغیب دینا بھی نیک اولاد کا فرض ہے۔

اپنے فرائض سے غفلت کا نتیجہ: گھریلو جھگڑے اور بے سکون زندگی

والدین کو اپنی اولاد سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے اور یہ محبت اللہ نے فطرتاً انسان میں رکھی ہے' جبکہ اولاد کو اپنے والدین کما حقہ پیارے یا ہر دل عزیز نہیں ہوتے یا دوسرے معنوں میں اولاد والدین سے اتنا پیار محبت کر ہی نہیں سکتی جتنا والدین اولاد سے کرتے ہیں۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اولاد کے لیے والدین کی خدمت فرض قرار دے دی' ان کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھنا عبادت قرار دے دیا۔ والدین کے پاؤں کے نیچے جنت رکھ دی —— بیٹے کے لیے تاحیات اور بیٹی کے لیے شادی سے پہلے تک والدین کے حقوق یکساں عائد ہوتے ہیں۔ بیٹے پر (حقوق اللہ کے بعد) اپنے والدین سے زیادہ پوری زندگی کسی اور کا حق فائق نہیں رہے گا (خواہ اپنی بیوی ہو یا اولاد) اور بیٹی پر فرض ہے کہ اپنی شادی تک اپنی والدہ کا ہاتھ بٹائے اور ان کی خدمت میں کوئی کمی نہ آنے دے۔ ہاں شادی کے بعد اس پر اس کے شوہر کا حق اپنے والدین سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے اور اپنے والدین کا حکم ثانوی درجے میں چلا جاتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں یہ رویہ پروان چڑھ رہا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی یا بیٹی دنیوی تعلیم میں اس قدر مصروف کر دی جاتی ہے کہ والدین کے حقوق کے بارے میں اُسے سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا اور پھر والدین بھی اپنی اولاد کو ان کے فرائض نہیں بتاتے۔ آخر میں ہوتا یوں ہے کہ بیٹی بھاوج پر اور بیٹا بیوی پر اپنے والدین کی ذمہ داری ڈال کر فارغ ہو جاتا ہے۔ پھر والدہ صاحبہ بھی صحت مند ہونے کے باوجود اپنے گھر کی تمام ذمہ داریاں جوان پر تاحیات عائد تھیں' بہو پر ڈال کر فارغ ہو جاتی ہیں۔ اب گھر کی بہو پر نند' شوہر اور ساس کی عائد کی ہوئی ذمہ داریاں بھی ہیں' اور پھر شوہر کا ہر حکم ماننا اور اس کا خیال رکھنا بھی فرض ہے۔ شوہر کے والدین کی خدمت بھی (چونکہ معاشرے نے فرض بنا دیا ہے) بہو کو ہی کرنی ہیں اور پھر اپنے بچے بھی اس نے سنبھالنے ہیں۔ یہ ایک طرف تو جدید غلامی کی بدترین تصویر ہے اور دوسری طرف اپنے فرائض سے بغاوت' غفلت' آمریت اور ظلم کا ایک المناک باب ہے جس کی زد سے شاید ہی کوئی گھرانہ بچ سکے۔ بہوؤں کے جلنے' خودکشی' بے انتہا ظلم سہہ سہہ کر نیم پاگل ہو جانا' طلاق اور خلع کی خبریں ایسے ہی عام نہیں ہو گئی ہیں' لازماً ان بھیانک واقعات کے پیچھے کوئی نہ کوئی کردار کارفرما ہے۔

اس حوالے سے یہ بھی یاد رکھیں کہ اگر بیٹا اپنے والدین کی خدمت خود کر سکتا ہے تو وہ خود کرے' لیکن جہاں مجبوری ہو وہاں وہ اپنی بیوی کو بھی پابند کر سکتا ہے کہ وہ اس کے والدین کی خدمت کرے اور ان کی ضروریات کو پورا کرے۔ اس حال میں بیوی اگر انکار کر دے تو وہ گنہگار ہو گی۔

بہرحال یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس کو کما حقہ ادا کرنا تقریباً ناممکن ہے' لیکن حق کو حق

بیان کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ اس وقت معاشرے اور خاندانوں میں جو فساد جڑ پکڑ چکا ہے' گھر اجڑنے کی شرح کافی حد تک بڑھ چکی ہے اور دوسری طرف بوڑھے والدین کے لیے اولڈ ہومز بنائے جا رہے ہیں' یہ ایک انتہائی بگڑے ہوئے معاشرے کے نمایاں خدوخال ہیں۔ اس سب کی بنیادی وجہ اپنے فرائض سے اعراض اور پہلوتہی ہے—— الحمدللہ میرے اپنے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں لہٰذا میں خود اس مقام پر اللہ سے بہت ڈرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ جو میرے خیالات ہیں وہ اگر صحیح ہیں تو راہ عمل میں میرے قدم نہ ڈگمگا جائیں اور کہیں میں اللہ کے بجائے بیٹوں پر توکل کر کے ان کو سہارا نہ سمجھ بیٹھوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اولاد کو ان کے فرائض' جو بحیثیت اولاد ان پر من جانب اللہ عائد ہوتے ہیں' پوری دیانت داری سے بتا دوں تاکہ بعد میں نہ مجھے پچھتانا پڑے اور بلاوجہ کسی بے گناہ اور مظلوم کو اس کا قصوروار نہ ٹھہراؤں۔ اعاذنا اللّٰہُ منھا۔

والدین کی اطاعت اور خدمت اولاد پر فرض ہے

والدین کی خدمت' اطاعت' محبت یہ اولاد کے فرائض میں شامل ہیں۔ یاد رکھیں کہ دعاؤں کی قبولیت کا ایک راز اسی میں پنہاں ہے کہ اپنے والدین کے کام خود کریں۔ نبی اکرم ﷺ نے والدین کی خدمت کو نفلی حج اور عمرے سے افضل قرار دیا ہے۔ والد کو کندھے پر بٹھا کر طواف کرانے والے کو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنے والد کی ایک رات کا بدلہ بھی نہیں دے سکے۔ ساری رات ماں کے سرہانے دودھ کا گلاس لے کر کھڑا رہنے والے شخص کی اپنی تھکاوٹ اور محنت کا اندازہ کیا ہی نہیں جا سکتا جو سارا دن اپنی بھیڑیں بکریاں چرا کر روزی کماتا ہو۔ لیکن اپنی جنت کو کسی کے حوالے نہیں کیا جا سکتا اور نہ کسی کی جنت خود حاصل کی جا سکتی ہے۔ سورۂ مریم میں والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کے حوالے سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف کی گئی: ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا﴾ ''وہ (یحییٰ) اپنے والدین کے فرمانبردار تھے اور سرکش اور نافرمان نہ تھے''۔ آگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا﴾ ''مجھے اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا (بنایا ہے) اور اللہ نے مجھے سخت دل اور بدبخت نہیں بنایا''۔ یہ دونوں آیات اس بات کی نشاندہی کر رہی ہیں کہ ماں باپ کا حکم معروف میں ماننا کس قدر لازم ہے۔

اولاد کے لیے عملی زندگی میں بہترین عمل والدین کو راضی رکھنا ہے۔ اولاد کے لیے حق بات پر والدین کی رہنمائی کرنا بھی لازم ہے' لیکن عاجزی' انکساری اور لجاجت سے۔ جیسے سورۂ

مریم میں بیان کیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کس خوبصورت انداز میں اپنے والد کو حق کی دعوت دی۔ مزید آپؑ کی دعائیں والدین کے حق میں قرآن میں جابجا ملتی ہیں۔ پھر ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی والد کی اطاعت وفرمابرداری کی عظیم مثال قائم کی جس کا تذکرہ قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے: ﴿یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ﴿۱۰۲﴾﴾ (الصّٰفّٰت) ''اے اباجان! آپ کو جو حکم ملا ہے آپ کر گزریں' ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔''

دوسری طرف اولاد اگر نافرمانی یا بدزبانی کی مرتکب ہو اور والدین کی خدمت سے اعراض کرنے والی ہو تو احادیث مبارکہ میں اسی اولاد کے لیے جابجا وعید نظر آتی ہے۔ ایک مشہور حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ منبر پر سے اترتے ہوئے تین مرتبہ آمین کہا۔ پوچھنے پر آپؐ نے بتایا کہ جبرائیلؑ میرے پاس آئے تھے اور تین اشخاص کے بارے میں انہوں نے ہلاکت وبربادی کی دعا کی اور میں نے ہر بار آمین کہا۔ ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس کی زندگی میں اس کے والدین بوڑھے ہوگئے لیکن اس شخص نے ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہیں کی۔ ایک شاعر نے اس حدیث کو اپنے اشعار میں بہت خوبصورت انداز میں ڈھالا ہے ؎

اک دن رسول پاکؐ نے اصحاب میں یہ لفظ
دہرائے تین بار کہ ناک اس کی کٹ گئی
اصحاب نے کہا کہ وہ بدبخت کون ہے
توقیر جس کی عظمت باری میں گھٹ گئی
ارشاد یہ ہوا کہ وہ فرزندِ ناخلف
گھر جس کے جنت آئی اور آ کر پلٹ گئی
ماں باپ کا جسے نہ بڑھاپے میں ہو خیال
اس ناسعید بیٹے کی قسمت اُلٹ گئی

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

- ہمارا دین ''دینِ توحید'' ہے اور ''توحید'' کی ضد ''شرک'' ہے۔
- شرک سب سے بڑا گناہ ہے اور ناقابلِ درگزر ہے۔
- قرآن کی رو سے شرک ''ظلمِ عظیم'' ہے۔
- شرک ہر دور میں نئی نئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔
- مسلمان جہالت اور ناسمجھی کے سبب شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شرک کی حقیقت اور اس کی اقسام سے واقفیت' اور دورِ حاضر کے شرک سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ کیجیے:

حقیقت واَقسامِ شرک

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد

کی چھ فکر انگیز خطابات

معیاری کمپیوٹر کمپوزنگ ۞ عمدہ طباعت ۞ 128 صفحات

قیمت: اشاعت عام: 50 روپے' اشاعت خاص: 90 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خدام القرآن لاہور**

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501

email: maktaba@tanzeem.org Website: www.tanzeem.org

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیں۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 400 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 250 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042
maktaba@tanzeem.org